دوسری بدنامی

ش مظفر پوری

مکتبہ نئی زندگی
۲۱۷۵۔ قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

فہرست

۱۔ دوسری بدنامی ۵
۲۔ نازک بات ۸۰
۳۔ عورت کا تیسرا جنم ۹۸
۴۔ ۳۱ر مارچ ۱۱۹
۵۔ ایک شام ۱۳۲
۶۔ نفرت ۱۴۵

دوسری بدنامی

پہلی بار ایسا ہوا کہ کالج کی سہیلیوں نے کینٹین میں چائے پینے کو پکڑ لیا۔ دوسری بار کالج کے کمپاؤنڈ میں ایک لڑکے نے سائیکل سے ایک لڑکی کو دھکا دیدیا جس پر بڑا تماشہ اور ہنگامہ برپا ہو گیا۔ تیسری بار ایک فرینڈ کو زہرہ کے بیان کے مطابق ایک "گرل فرینڈ" سے ایک کتاب لینی تھی۔ کالج کی واپسی میں وہ مچل گئی کہ بس چل کر لے ہی لو اور آج چوتھی بار۔

نہ جانے آج زہرہ دیر سے لوٹنے کا کیا عذر پیش کرنے والی تھی۔ آج تو کالج سے واپس آنے میں ہر بار سے زیادہ دیر ہو رہی تھی۔ بیگم سلمہ ہاشمی نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی۔ دل میں کہا "مگر وہ نیک بخت آ بھی تو چکے۔ پھر وہ اکتاہٹ کی جماہی لے کر بڑی آہستگی سے پلنگ پر لیٹ گئیں نوکرانی ان کی الجھن اور بے چینی کو بھانپ رہی تھی۔ بار بار کمرے میں آتی اور چپ چاپ لوٹ جاتی۔ آخر ایک بار وہ بول ہی پڑی "چائے دوسری بار ٹھنڈی

ہو رہی ہے بیگم صاحب آپ پی لیجئے چھوٹی بی بی آتی ہوں گی۔"

"ابھی رہنے دو" سلمہ بیگم نے مختصر سا جواب دیدیا۔

وہ اکیلی چائے پینے کی عادی نہیں تھیں۔ اور تھا ہی کون۔ ایک زہرہ سو وہ بھی کیسی لاابالی تھی۔ بی اے میں پڑھتی تھی۔ مگر ماں کے دل کو نہ سمجھ پائی تھی۔ جتنی دیر وہ کالج میں ہوتی ماں اپنے اسکول میں رہتی۔ بس اس کے سوا زہرہ کا نگاہوں سے اوجھل رہنا ماں کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ سلمہ بیگم نے پھر گھڑی کی طرف دیکھا۔ ڈیڑھ گھنٹہ دیر ہو چکی تھی۔

بے خیالی میں اِدھر اُدھر گھورتے ہوئے ان کی نظر میز پر پڑے ہوئے لفافہ پر گئی۔ زہرہ کے نام تھا۔ کھولا نہیں گیا تھا، وہ بڑے قاعدے ضابطے کی خاتون تھیں دوسروں کے خط کھولنا یا پڑھنا معیوب سمجھتی تھیں۔ مگر کیا جی میں آیا کہ انہوں نے بڑھ کر لفافہ اٹھا لیا اور کافی پس و پیش کے بعد چاک کر دیا۔

مختصر سا سیدھا سادا خط تھا۔

مس ہاشمی!

آداب۔ ادھر کچھ دنوں سے تو آپ سے ملنا ہی نہیں ہوا۔ کتاب آ گئی ہے جس کی آپ نے فرمائش کی تھی۔ میں پڑھ چکا ہوں۔ آپ کے لئے رکھی ہے۔ خودے جائیے یا کہئے تو میں ہی پہنچا دوں۔ سوچا۔ معلوم نہیں کب آپ سے ملنا ہو۔ اس لئے آگاہ کر رہا ہوں۔ آپ اس کے لئے بے چین بھی

تو تھیں ۔ اُمید ہے کہ آپ ضرور ——

مخلص منصور صدیقی

خط بے ضرر ہی تھا ۔ کوئی خاص بات تو نہ تھی ۔ پھر بھی سلمہ بیگم نے خط کے آخری اور ادھورے فقرے پر بار بار توجہ کی :- "امید ہے آپ ضرور" آخر "ضرور" کیا ؟ شاید خط کا سارا مزا "ضرور" میں پوشیدہ تھا ۔ پھر انہوں نے سوچا کہ منصور صدیقی اس کا کلاس فیلو تو ہو ہی نہیں سکتا ۔ ورنہ خط لکھنے کی ضرورت ہی کیوں پڑتی ، پھر یہ کون ہے ؟ زہرہ سے اس کی شناسائی اور ملاقات کیسی ہے ؟ زہرہ اس سے کہاں ملتی ہے ؟ اس نے کتاب لینے کے لئے زہرہ کو کہاں بُلایا ہے کہیں چپکے چپکے لڑکی مجھ سے دور اور کسی غیر کے قریب تو نہیں ہوتی جا رہی ہے " —— کہیں ایسا تو نہیں کہیں ویسا تو نہیں :-

بیگم سلمہ ہاشمی اسکول سے تھکی تھکائی آئی تھیں لیٹے لیٹے سامنے کی دیوار پر مرحوم شوہر کی بڑی سی تصویر پر نگاہ پڑ گئی ۔ ذرا دیر وہ تصویر کو ٹکٹکی لگائے دیکھتی رہیں اور پھر جیسے خود بخود آنکھیں بند ہو گئیں نیند نہیں آئی ، بلکہ ماضی کی یادوں میں گم ہو گئیں نہ جانے کتنے برس بیت گئے —— کچھ یہی چڑھتا ہوا سن و سال رہا ہوگا ۔ مگر وہ زہرہ سے ذرا بھاری پڑتی تھیں ۔ اور قد بھی کچھ نکلتا ہوا تھا یہ تو دھان پان ہے ، اس کی طرح وہ کم سخن اور سنجیدہ بھی نہیں تھیں ۔ زہرہ کی طرح ان کے چہرے پر مفکرانہ متانت نہیں تھیں ۔ یہ تو صورت سیرت میں باپ پر گئی

ہے بس ذرا رنگ کچھ زیادہ صاف ہے۔ سلمہ بیگم تو بڑی خوش باش اور خوش پوش تھیں وہ اپنی خوش قامتی، شگفتہ بیانی اور چست پوشی کے لیے شہرت رکھتی تھیں بڑے باپ کی چہیتی بیٹی تھیں، ناز و نعمت میں پلی تھیں۔ آسائش اور آرائش کی زندگی تھی۔ سوسائٹی میں عزت اور اہمیت تھی۔ کس کس کی نظر نہ رہی ہوگی ان پر۔ عجیب کی بات ہے تب وہ بھی فورتھ ایر ہی میں پڑھتی تھیں۔ کیا اسٹوڈنٹ کیا پروفیسر کالج کا کالج ان کی ایک نگاہ غلط انداز کو حاصل زندگی سمجھتا تھا۔ ایسا بے سبب نہیں تھا۔ کتنی ہی مہ لقاؤں کا چراغ ان کے سامنے گل ہو جاتا تھا۔ قدرت نے ان کی ساخت پر اپنی صناعی کو کچھ ارزاں کر دیا تھا۔ شہر میں ان کا شہرہ تو تھا ہی، مگر فلمی ہیروئنوں کی طرح ان کے بارے میں آئے دن افسانے بھی مشہور ہوتے رہتے۔ مفروضہ اور بے بنیاد۔ صرف ایک افسانے میں کچھ حقیقت تھی۔ نامراد چاہنے والوں کو ان کی بے اعتنا نظر اور جلوے کی خیرات ہی کافی تھی۔ ان پر شعر کہے گئے نظمیں لکھی گئیں۔ دل جلوں نے ناشائستہ لطیفے مشہور کیے۔ ان سے منسوب کر کے عاشقانہ شعروں کی پیروڈی کی۔ مگر کبھی ان کے کان پر جوں تک نہ رینگی تب وہ سلمہ ہاشمی نہیں سلمہ صدیقی تھیں۔ ایک نظم ایسی بھی تھی جس نے انھیں متاثر کیا تھا۔ وہ نظم کالج میں مشہور ہو چکی تھی اگر حسن و جوانی کی مدح سرائی میں ایسے ساحرانہ اشعار قلوپطرہ کے لیے کہے گئے ہوتے تو وہ اپنا تاج شاعر کے قدموں میں رکھ کر اس کی لونڈی بن گئی ہوتی،

مگر سلمہ صدیقی نے بظاہر ان شعروں کو رسمی داد کے قابل بھی نہ سمجھا۔ ایک روز ایک لڑکے نے جی کڑا کر کے سب کے سامنے کہہ دیا: "یہ غیر فانی نظم آپ پر آپ کے لئے لکھی گئی ہے" تو انہوں نے ایک زہر خندہ کے ساتھ برجستہ جواب دیا تھا: "دیکھئے آپ اپنی ہمشیرہ کو ملا ہوا اعزاز زبردستی میرے سر تھوپ رہے ہیں کسی بھائی کو ایسی خیانت کرتے نہیں دیکھا"

اس انداز گفتگو پر دو تین منٹ کے لئے کلاس پر سکتہ طاری رہا مگر اس حادثے کے بعد کالج میں نظم کی شہرت اور بڑھ گئی۔ جب نے سلمہ صدیقی کے خلاف فتنہ کی صورت اختیار کر لی۔ بلکہ یہ ان کی چڑ بن گئی۔ شاعر کے خلاف دل میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ شاعر باہر کا نہیں کالج ہی کا تھا۔ بلال ہاشمی۔ انگریزی کا پروفیسر جس کو چڑ سے انہوں نے "بلال حبشی" کہنا شروع کر دیا تھا۔ حالانکہ وہ کالا نہیں تھا۔ نکھرتا ہوا سانولا رنگ تھا۔ جسے نہ گورا سمجھئے نہ کالا کہئے گٹھے ہوئے بدن اور غیر معمولی ناک نقشے کا جوان آدمی تھا۔ آدمی کا ہے کو مقناطیس تھا کمبخت۔ ایک سلمہ صدیقی کو چھوڑ کر باقی سب ہی اس کی طرف کھینچے رہتے۔ انگریزی ادب کا پروفیسر اور اردو کا رومانی شاعر اس کی گفتگو تک میں شعر و ادب کا رچاؤ تھا۔ ایک سلمہ صدیقی تنی تھیں تو کیا ہوا مگر خوبیاں تو تھیں۔ سلمہ صدیقی کو اعتراف نہ سہی احساس ضرور تھا۔ تحسین ناشناسی کا جواز صرف یہ تھا کہ اس نے نظم لکھ کر ان کو ہم چشموں میں رسوا کر دیا تھا۔

آخر انتقام کی گھڑی آ گئی۔

کالج میں مشاعرہ تھا مشاعرہ کیا مشاعرہ اور کوی سمیلن کی کھچڑی تھی۔ ہندی اردو والے باری باری پڑھ رہے تھے عجیب مکھچر سا ہو ہو جاتا تھا۔ ایک ہندی کوی صاحب جو کھڑے ہوئے تو مثنوی جیسی کوئی چیز شروع کر دی۔ ستم یہ کہ ترنم سے پڑھنے لگے کافی دیر لگنے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے پچھلی صفوں کے سامعین نے موقع غنیمت جانا اور اٹھ اٹھ کر باہر جانے لگے چند لڑکیاں بھی بور ہو کر نکل پڑیں جن میں سلمہ صدیقی بھی تھیں لڑکیاں ایک گوشے میں کھڑی شاعروں پر تبصرہ کرنے لگیں ابھی سلمہ صدیقی کے "بلال حبشی" کی باری نہیں آئی تھی، شامت اعمال بلال ہاشمی بھی اسی سائبان میں پہنچ گیا۔ جہاں لڑکیوں کا گروپ پہلے ہی سے موجود تھا وہ بے چارہ قصداً اُدھر نہیں گیا تھا۔ دوسری لڑکیاں تو مرعوب ہو کر کانا پھوسی کرنے لگیں مگر سلمہ صدیقی کو کچھ شرارت کی سوجھی سوچا موقع اچھا ہے۔ دل کی بھڑاس نکال لیں وہ چپکے سے پروفیسر کے پاس جا کر کھڑی ہو گئیں۔ وہ انھیں سر سے پاؤں تک غور سے دیکھتا رہا۔

"گستاخی معاف" سلمہ ذرا تیکھے شکایتی انداز میں منہ سے پھوٹیں "سر آپ اس طرح گھور گھور کے ہمیں نہ دیکھا کریں جی ڈرتا ہے۔ شاید لڑکیوں کو اس طرح گھورنا اخلاق و ادب کے خلاف بھی ہے۔"

پروفیسر نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ وہ حیران رہ گیا۔ یہ تو بالکل آ بیل مجھے مار والی حرکت تھی۔ سلمہ سے اس کی ذاتی گفتگو آج تک کبھی نہ ہوئی تھی سلمہ منتظر تھیں کہ وہ کچھ لور سنا سکیں مگر وہ چپ ہی رہا اور سلمہ کے

اس خواہ مخواہ پن پر مسکرانے لگا۔

"آپ تو بس دیکھے ہی جا رہے ہیں۔ کچھ کہئے تو سہی"۔

آج پروفیسر ہاشمی کی نظم کی مخاطب اس کے اس قدر قریب تھی۔ اس کی خاموش پرستش کو زبان مل گئی اور اس نے کسی کا برمحل شعر پڑھ لیا۔

"تم مخاطب بھی ہو قریب بھی ہو
تم کو دیکھوں کہ تم سے بات کروں"

سلمہ پر بظاہر اس شعر کا کچھ اثر نہ ہوا۔ استہزائیہ لہجے میں بولیں "ہاں ہاں، رک کیوں گئے۔ کہتے جائیے، بدنام تو کر ہی دیا۔ اب کیا شہر چھڑوانے کی ٹھان لی ہے؟"۔

پروفیسر کو اپنے خوابوں کی شہزادی کی یہ ادا اور بھی گھائل کر گئی شاعر نے پروفیسر کا لبادہ اتار دیا اور سلمہ کو ایسی نظروں سے دیکھنے لگا گویا وہ اس کے چہرے پر اپنی نظم پڑھ رہا ہو، پھر اپنے آپ زیر لب بولا "کون کہتا ہے شاعری میں سحر نہیں ہے"۔

سر اس طرح آپ مجھے کیا دیکھ رہے ہیں میری بات کا جواب دیجئے میں رپورٹ کر دوں گی"۔

"میں آپ کو نہیں چاند کو دیکھ رہا ہوں" پروفیسر نے شاعری کی۔

"آپ کو رتوندھی ہو گئی ہے سر۔ چاند نیچے نہیں اوپر ہے آسمان پر"۔

"مجھے تو نظر نہیں آتا۔

"میں تو دیکھ رہی ہوں یہ طباق سا چاند ہے"۔

"وہ تو آپ کو اپنا عکس نظر آرہا ہے؟"

"کبھی اپنا عکس بھی دیکھا ہے آپ نے؟"

"آج دیکھ رہا ہوں" جب آئینہ سامنے ہے۔ سلمہ صدیقی لاجواب ہو کر چند لمحے کے لئے خاموش ہو گئیں۔ پھر لہجہ بدل کر تمسخر سے بولیں، "کیا سر سچ مچ آپ مجھ پر عاشق ہوئے ہیں؟"

پروفیسر ہاشمی کے وقار پر یہ بھرپور وار تھا مگر اس نے زہر کو امرت بنا ڈالا۔

"یہ قصور تو زمانہ بھر سے ہوا ہے مجھے زمانے کا رقیب ہی سمجھ لیجئے۔"

"سر اتنی صاف بات کہتے آپ کو دھڑکا نہیں ہوتا، تو کیا شرم بھی نہیں آتی؟" سلمہ نے اتنی سخت بات نہایت نرم لہجے میں کہہ دی۔

"میں تو ڈرتا ہی تھا جو چپ تھا۔ آخر آپ کو خود ہی زحمت لب کشائی کرنی پڑی۔"

"آپ اتنے بڑے اسکالر اتنے باوقار پروفیسر ایسی سوقیانہ باتیں کرتے، ایسا عامیانہ اظہار عشق کرتے عار محسوس نہیں ہوتی؟

"آپ نے بڑے بڑے تاجداروں کو رسوا کیا ہے۔ میری کیا حقیقت ہے! اگر خدا نہ ہوتا تو آپ کی ہی خدائی ہوتی۔ یہ چاند سورج، یہ سمندر سب آپ ہی کے تابع ہوتے اور زمین پہ تو آپ کی خدائی ہے ہی"

"حسن کو مدح وستائش کے افسوں نے رام کر لیا۔ حسن کی کمزوری مدح وستائش ـــ

"آپ رک کیوں گئے۔ کچھ اور"

"آپ کو دیکھ کر زمین کی گردش رک سکتی ہے، دریا کی روانی رک سکتی ہے۔ میری زبان رکی تو کیا رکی"

اب سلمہ صدیقی محسوس کرنے لگیں کہ لڑکھڑا کے پروفیسر کے بازوؤں میں گر جائیں گی۔ تقریباً دس منٹ گزر چکے تھے۔ اندر ہال میں کوئی صاحب ابھی تک دوہے پر دوہے دھڑ دھڑائے جا رہے تھے سلمہ صدیقی کی ہمجولیاں یہ جاننے کے لئے بے تاب ہو رہی تھیں کہ پروفیسر کو انہوں نے کس طرح کھنگالا۔ پھٹکارا۔ دو چار لڑکے بھی ادھر ادھر گھات لگائے اس واردات کا نظارہ کر رہے تھے۔ بس دور سے دیکھ ہی رہے تھے۔ دونوں کی باتیں کوئی سن نہیں پایا تھا۔

سلمہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اب کیا کہیں۔ انہوں نے سپر ڈال دی۔ ہمجولیاں کی طرف مڑنے سے پہلے نگاہیں نیچی کر کے دھیمی اور شکست خوردہ آواز میں صرف اتنا کہہ سکیں "بس سر، اب اور نہیں بدنام نہ کیجیے۔"

اور جواب کا انتظار کئے بغیر ساتھیوں میں جا ملیں۔

اندر کوئی صاحب دوہوں کی بوچھاڑ ختم کر چکے تھے اور پروفیسر بلال ہاشمی کا نام پکارا جا رہا تھا پروفیسر ہال کی طرف لپکا جو لوگ باہر تھے وہ بھی ہال کی طرف بڑھے۔ لڑکیوں نے بھی ہال کا رخ کیا۔ مگر حجاب اور جھینپ کے مارے سلمہ صدیقی کے قدم زمین سے جیسے

چپک چپک جا رہے تھے۔ پھر بھی وہ کشاں کشاں اندر پہنچ گئیں۔

جب پروفیسر ہاشمی نے مائک پر کہا مطلع عرض ہے۔ تو محفل مشاعرہ کی جیسے ہوا بھی ساکت ہو گئی۔ جیسا کہ خوش الحان اور خوش بیان شاعروں کی شعر خوانی میں ہوا کرتا ہے۔ مطلع سے مقطع تک ہر شعر پر والہانہ داد ملی۔ بعض لڑکیوں نے داد دینے کے جوش میں آنچل اور دوپٹے لہرا لہرا دیئے مگر سلمہ صدیقی کی زبان ایسی کنجوس کہ ہلکی سی "واہ" بھی نہ نکل سکی۔ دراصل وہ ہر شعر میں اپنے سے تخاطب محسوس کرتی رہیں رہ رہ کے لوگوں کی نظریں بھانپتی رہیں کہ کوئی ان کے چہرے کے مدوجزر کو دیکھ تو نہیں رہا تھا کوئی ان کی طرف دیکھ کر کچھ تاڑنے کی کوشش تو نہیں کر رہا تھا۔ یہ محض سلمہ صدیقی کے دل کا چور تھا۔ واہمہ تھا۔

البتہ غزل ختم کرنے کے بعد جب پروفیسر ہاشمی نے مائک چھوڑنا چاہا تو پچھلی نشستوں سے یکبارگی "کچھ اور کچھ اور" کی آوازیں اٹھیں۔

"ایک اور ہو گی"

"کچھ اور عنایت ہو"

"ایک غزل اور"

پھر ایک جیالے طالب علم نے ___ وہی جو کلاس روم میں سلمہ صدیقی سے ایک بار کا چوٹ کھایا ہوا تھا۔ کھڑے ہو کر دونوں ہاتھوں کے اشارے سے بولنے والوں کو خاموش کرتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ وہ سنائیے۔ وہ وہی۔ گل رخ گلرخاں، مہ وش مہوشاں"

اور اس کی تائید میں بہت سی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں "ہاں ہاں وہی"۔

وہی مشہور یا بدنام زمانہ ۔ سلمہ صدیقی کی چڑ۔

سلمہ صدیقی کے لئے یہ لمحہ بڑے ضبط اور امتحان کا تھا۔ وہ اٹھ کر بھاگ بھی نہیں سکتی تھیں۔ تب تو بات اور بھی کچھ سے کچھ ہو جاتی ان کے چہرے پر ایک رنگ آتا ایک جاتا تھا۔ عجیب کشمکش، عجیب کیفیت تھی۔ اس نظم کی فرمائش پر کتنی ہی نظریں سلمہ صدیقی کی طرف اٹھی تھیں، ہر نظر انھیں کانٹے کی طرح چبھتی ہوئی لگی۔ جاڑے کا موسم تھا۔ اس کے باوجود ان کی پیشانی پر پسینے کی نمی آگئی۔ ایک گوشے سے تبر چلا "پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے" دوسرے گوشے سے کسی نے تائیدی چھینک مار کر سلمہ صدیقی کی تلملائی ہوئی کیفیت کو اور بھی طشت از بام کر دیا وہ منٹ منٹ پر پہلو بدلنے لگیں۔ کوئی آڑ ملتی تو چہرہ چھپا لیتیں۔ روشنی ہی ذرا دھندلی ہوئی ہوتی تو کوئی آنکھوں کا سکڑنا ہونٹوں کا پھڑکنا اور رخساروں کا کپکپانا نہ دیکھ پاتا۔ اِدھر اُدھر دیکھنے کا یارا نہ تھا۔ سیدھے ڈائس پر نظریں جمائے بیٹھی رہیں"۔

پروفیسر ہاشمی نے مائک پر کہا "نظم طویل ہے۔ آپ لوگ بور ہو جائیں گے۔ مگر جب مچل ہی گئے ہیں تو سناتا ہوں۔ معمولی سی رومانی نظم ہے۔

"قاتل سی کہئے" پیچھے سے ایک چور آواز آئی۔

"نظم کا عنوان ہے گلِ رخ گلرخاں مہ وشِ مہوشاں"

"ہاں ہاں آج آمنے سامنے ہی ہو جائیے"

دوسری جور آواز آئی۔ اسی چوٹ کھائے ہوئے ہمشیرہ والے لڑکے کی۔ ہال میں ہلکی ہنسی کی پھلجھڑی سی چھوٹ گئی۔ اور کچھ نگاہیں بے ساختہ سلمہ صدیقی کی طرف اٹھ گئیں۔ سلمہ صدیقی معاً اس طرح کھڑی ہو گئیں، جیسے کسی اسپرنگ نے اچھال کر انھیں سیدھا کر دیا ہو۔ پہلے ثانیہ میں ان کے قدم کو جنبش ہوئی کہ واک آؤٹ کر جائیں مگر۔ دوسرے ہی ثانیہ میں شعور نے ان کے کان میں کہا: لوگ کیا سمجھیں گے؟ بات کا بتنگڑ بن جائے گا۔ اور تیسرے ثانیہ میں وہ بیٹھ چکی تھیں۔

نظم شروع کرنے سے پہلے پروفیسر ہاشمی نے بھی ایک نظر اُن پر ایسی ڈالی گویا روئے سخن انھیں کی طرف ہو۔ دو چار شعروں تک تو زندہ دلوں نے چھینٹے اڑائے لیکن اس کے بعد محفل شاعر کی سحر بیانی اور اشعار کی خیال انگیزی میں کھو گئے۔ شاعر کی مصورانہ پیکر نگاری کے سحر سے سامعین بت بن کر رہ گئے۔ کبھی جل پری سمندر سے نکل کر ساحل کی چٹان پر بیٹھی ہوئی نظر آئی کبھی انھوں نے شبِ عروسی کی آراستہ خوابگاہ میں مدہ ماتی حسینہ کو دیکھا۔ کبھی ان کی آنکھوں نے جواں سال ملکہ کو شاہانہ جلال و جمال کے ساتھ تخت زریں پر دیکھا۔ کبھی شعاعِ حسن سے محفل کو جگمگانے والی مغنیہ نے ان کی آنکھوں کو چکا چوند کیا۔ پائل کی ہر جھنکار، اعضاء کے ہر لوچ اور سراپا کی ہر لرزش پر حشر بپا

کرنے والی رقاصہ نے کبھی ہوش ایمان کو لوٹا۔

دل میں سب کے تھا کہ یہ کس کے سراپا کی مصوری تھی اس لئے نظم ختم ہوتے ہی بعض نگاہوں نے سلمہ صدیقی کو ڈھونڈا تو وہ جا چکی تھی۔ سلمہ کو معلوم تھا کہ نظم کہاں ختم ہوتی تھی۔ جب دو تین شعر رہ گئے تو وہ چپکے سے اٹھ کر چل دیں۔

نظم سننے سے لے کر رات کو نیند آنے تک وہ شعری پیکر، سلمہ صدیقی کی نگاہوں میں گھومتا رہا اس نظم کے گنگناتے ہوئے مصرعے ان کے ذہن میں آتے اور جاتے رہے بار بار دل میں آیا۔ کیا واقعی یہ نظم میرے ہی لئے ہے کیا میرا حسن میرا شباب سچ مچ ان تشبیہوں پر پورا اترتا ہے میں کسی شاعر کو اس شیفتگی اور وارفتگی کی حد تک متاثر کر سکتی ہوں؟ سلمہ صدیقی کا احساس جھوم جھوم اٹھا۔ دنیا انھیں اپنے قدموں میں سرنگوں نظر آنے لگی پروفیسر کے الفاظ یاد آئے ”آپ کو دیکھ کر زمین کی گردش رک سکتی ہے دریا کی روانی رک سکتی ہے“ اس خیال سے دل میں غرور انگڑائیاں لینے لگا۔

لیٹے لیٹے اچانک اٹھ بیٹھی دل کو ایک ترغیب نے گدگدایا پلنگ سے اتر کر تیز روشنی میں قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئیں اپنے چہرے اور سراپا کو ہر زاویے سے پوز بدل کر دیکھا۔ ایک ایک شعر ایک ایک تشبیہ کی کسوٹی پر اپنے آپ کو پرکھا پھر بھی تشفی نہ ہو سکی تو ایک ناشائستہ اور وحشیانہ ترغیب نے دل کو ورغلایا۔ وہ قد آدم آئینے میں جل پری

کے روپ اور زہرہ کے مرمریں مجسمے کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی تھیں۔ کیا میں واقعی جل پری اور زہرہ کا مجسمہ ہوں؟ کیا واقعی میری جلد اتنی نازک اور شفاف ہے کہ اس کی تہوں میں خون کو رواں دواں دیکھا جا سکتا ہے اور سلمہ صدیقی نے کھڑکی بند کر کے کواڑ کی چٹخنی چڑھا دی اور قد آدم آئینے میں جل پری اور زہرہ کے مجسمہ کو دیکھا جی بھر کے دیکھا۔

رات کو تو وہ خواب اور بیداری دونوں حالت میں اپنے آپ میں مدہوش رہیں اور دن کو اپنے سراپا نگار کے تصور میں کھوئی رہیں۔ انہوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ کسی دن ایک شاعر کے قدموں میں ریت کی دیوار کی طرح بھر بھرا کے ڈھے جائیں گی۔

مشاعرے کی سرگزشت کا احساس اتنا تازہ اور شدید تھا کہ وہ دو تین روز تک کالج کا رخ کرنے کی ہمت نہ کر سکیں۔ اور جب کالج گئیں تو جتنے منہ اتنی باتیں مشہور ہو چکی تھیں وہ ان کا سائبان میں پروفیسر ہاشمی سے دیر تک باتیں کرنا وہ مشاعرے میں ان کی رنگا رنگ کیفیتیں ان کا پروفیسر ہاشمی کو ٹکٹکی لگائے دیکھتے جانا اور ان سب پر مستزاد مشاعرہ کی رات کے بعد کئی روز تک کالج سے ان کا روپوش ہو جانا ان ساری باتوں کو یکجا کر کے کیا کچھ نہ فرض کر لیا گیا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ بات کالج سے باہر بھی بعض حلقوں میں زبان زد عام ہو گئی ہاشمی اور سلمہ کا رومان ہے سلمہ اور ہاشمی کا معاشقہ ہے حالانکہ مشاعرے کی رات کے بعد ان دونوں میں نہ ملاقات ہوئی نہ بات ہوئی۔ البتہ کلاس میں یا

کلاس سے باہر ایک دوسرے کو بے مدعا دیکھا کیے سوچا کیے۔

پروفیسر ہاشمی سے بے تکلف دوستوں نے مزاحاً استفسار کیا تو اس نے کہا۔ قصے مشہور ہوتے ہیں میں تو سمجھتا ہوں کہ سلمہ صدیقی کے نامراد عاشقوں نے یہ شوشہ چھوڑا ہے سلمہ صدیقی کو رسوا اور بدنام کرنے کے لئے یا مجھے چڑانے کے لئے یا پھر سلمہ کے ہاتھوں مجھے پٹوانے کے لیے۔"

ایسی باتوں کے تو پر لگ جاتے ہیں سینہ بہ سینہ ہوتی ہوئی یہ بات سلمہ صدیقی تک بھی پہونچی پٹوانے والی بات پر تو انھیں ہنسی آگئی۔ جب افواہیں بہت پھیلیں اور ان افواہوں میں دونوں کی ملاقاتوں کی چاشنی بھی شامل کی جانے لگی تو ایک دن ان کی ایک منہ چڑھی سہیلی نے چمٹ کر پوچھا "نہ میری قسم نہ تیری قسم۔ تجھے اپنے شاعر کی قسم اس نظم کا واسطہ جو تجھ پر لکھی گئی۔ سچ سچ بتا کہ بات کیا ہے۔ اور کہاں تک پہنچی ہے۔ آخر ہم سے کیا پردہ۔ پروفیسر ہاشمی کسی کا محبوب ہو تو یہ عار کی نہیں غرور کی بات ہے۔

سلمہ بولیں جو بھی بات ہے تم جانتی ہو مگر سچ سے تمہیں تشفی نہیں تو جھوٹ بات یہ ہے کہ...... سہیلی نے فوراً بات کاٹ دی "بس چپ بھی رہو، زیادہ بنو نہیں۔ سبھی تو کہتے ہیں۔ میرا دل بھی مانتا ہے" پھر ذرا توقف سے للچائی لہجے میں بولی "پیچ اچھا ہے"

"تم اپنے دل کے ساتھ جہنم میں جاؤ"، سلمہ جل کر بولیں۔

مگر بات کچھ سچی ہی تھی سلمہ پروفیسر ہاشمی کی طرف مائل ہو چکی تھیں مگر توقیر اور خودداری کا پاس تھا بدنامی کا دھڑکا تھا اس لئے تنظر محتاط

اور زبان خاموش تھی۔ اگر محبت کی رسمیں شروع ہو جاتیں تو لوگ شہر کی دیواروں پر پوسٹر چسپاں کرنے سے بھی نہ چوکتے۔

شاعر بھی کچھ کم فتنہ نہیں ہوتا۔ نت نئی افواہیں اور ان کا چکر چل ہی رہا تھا کہ پروفیسر ہاشمی کی ایک اور نظم چھپ گئی "اب اور ہمیں بدنام نہ کر" یاران طریقت اس کو بھی لے اڑے، خوب خوب، حاشیہ آرائیاں ہوئیں۔ افواہیں دونوں کے گھر اور خاندانوں تک پہنچ گئیں۔ چہ میگوئیاں ہونے لگیں، بات رسوائی اور بدنامی کی حدوں کو چھونے لگی۔ سلمہ کی تو ابھی منگنی ونگنی نہیں ہوئی تھی۔ مگر پروفیسر ہاشمی کے انتظار میں تو خاندان ہی میں ایک لڑکی کب سے مہندی رچانے کی حسرت لئے بیٹھی تھی۔ سلمہ کے ساتھ اس کے معاشقے کی افواہ جو اڑی تو لڑکی والوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ پروفیسر کے والدین کو بھی فکر اور پریشانی لاحق ہوئی۔ پروفیسر پر دباؤ پڑنے لگا کہ شادی کل چھوڑ آج ہی ہو جائے حالانکہ پروفیسر نے تو یہ ٹھان لی تھی کہ وہ آخر لمحہ تک سلمہ کے کنوارپن کا ساتھ دے گا، مگر اب بات کچھ ایسی آن پڑی تھی کہ وہ جرأت کر کے سلمہ سے دو ٹوک پوچھ ہی لینا چاہتا تھا۔ دریں اثنا پروفیسر کی شادی کی خبر بھی اڑی۔ اس پر یاروں نے فتنے کا رخ کچھ اس طرح موڑا۔ رومان کسی سے۔ شادی کسی سے۔ اس لئے تو رومان بدنام ہو کر رہ گیا ہے۔۔۔ وغیرہ

ان دونوں کے نامشکور اور نارسیدہ رومان کا اس قدر چرچا ہو چکا تھا کہ اب سلمہ صدیقی اپنے بارے میں پروفیسر ہاشمی کو الگ کر کے

سوچ ہی نہیں سکتی تھیں وہ پروفیسر کے ساتھ ناکردہ گناہ بدنام ہو چکی تھیں انھیں بے داغ اور پارسا سمجھنے والا شاید ہی کوئی ملتا۔ یہ زندگی اور مستقبل کا سوال تھا۔ پروفیسر کی شادی کی خبر سے ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ پروفیسر سے مل کر اس بات کو صاف کر لینا چاہتی تھیں۔ آخر پروفیسر کو ایک دن سلمہ صدیقی اُس کے مکان والی گلی کے نکڑ پر مل گئیں۔

سلمہ نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔ "سر آج میں آپ کے ساتھ کافی پیوں گی۔"

"آیئے چلئے" پروفیسر نے بلا تامل اپنے گھر کی طرف اشارہ کیا۔

گھر میں نہیں۔ باہر چلیں گے۔ سلمہ طے شدہ انداز میں بولیں۔ جیسے سب کچھ سوچ کر آئی ہوں۔

دونوں ایک ہوٹل کے کیبن میں آمنے سامنے بیٹھے ایک دوسرے کی پہل کے منتظر تھے۔

آخر پروفیسر نے کافی کی چسکی لیتے ہوئے گفتگو شروع کی۔ ویسے ہی کافی افواہیں پھیلی ہوئی ہیں اس طرح کسی نے یہاں دیکھ لیا تو اور بھی شعلہ بھڑک اٹھے گا۔"

"سلمہ بولیں" سر اب میں ان افواہوں کو حقیقت میں بدل ڈالنا چاہتی ہوں۔"

"میں سمجھا نہیں" پروفیسر بھونچکا سا رہ گیا۔

"آپ مجھ سے شادی کر لیجئے۔ کوئی اور چارہ نہیں" سلمہ نے دل کی بات بے دھڑک کہہ دی پروفیسر کو اپنے بخت کی یاوری پر اعتبار نہ آیا۔ جواب میں زبان جیسے بے نطق ہو گئی۔ کافی کا تلخ گھونٹ اس کے منہ میں اتنا میٹھا ہو گیا کہ حلق سے اتارنے کے لئے اس کو کاوش کرنی پڑی۔

کیا آپ کو یہ رشتہ پسند نہیں؟ سلمہ کو جیسے بڑی عجلت تھی۔ پھر ذرا جھینپ کر بولیں "یہ میں کیسے پوچھوں کہ میں بھی آپ کو پسند ہوں یا نہیں یہ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میں آئیڈل وائف بن سکتی ہوں۔"

اگر میرے بس میں ہوتا تو اس خوشی میں آپ کے قدموں پر چاند ستارے نچھاور کر دیتا — مگر — پروفیسر نے سگریٹ کا کش لینے کے لئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"مگر کیا؟"

سلمہ تشویش سے چونکیں۔

"آپ واقعی مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہیں یا کوئی مجبوری آن پڑی ہے؟

"دونوں باتیں ہیں آپ کے ساتھ میری اتنی شہرت ہو چکی ہے کہ اب کون مجھے بے داغ اور پارسا سمجھے گا ویسے آپ مجھے ناپسند بھی تو نہیں۔ ہم دونوں کا اچھا میچ کہا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے سنا

ہے کہ آپ کی جلد ہی کہیں شادی ہو رہی ہے۔ اس لئے وقت ضائع کئے بغیر میں زبان کھولنے پر مجبور ہو گئی تاکہ تکلّف اور حیا میں تیر کمان سے نکل نہ جائے میں آپ کو چھوڑ دوں تو آپ کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ اگر آپ نے مجھے چھوڑا تو میری زندگی پر نحوست کا سایہ پڑ جائے گا۔

آپ جانتے ہیں کہ میں مشرقی —— وہ بھی مسلمان لڑکی ہوں میرے دامن پر دھبہ تو کیا سایہ بھی نہیں پڑنا چاہیئے پریکٹیکل بات یہ ہی ہے۔

"آپ کا خیال صحیح ہے" پروفیسر کو گفتگو کا یہ انداز کاروباری محسوس ہوا تو اُس نے شک کا اظہار کیا "مگر آپ کی زبان پر وہ ایک لفظ نہیں آ رہا ہے جو سارے افسانے کا حل ہے"

چند لمحے ذہن پر پردہ ڈالنے کے بعد سلمہ بولیں "میں آپ کا مطلب سمجھ گئی" شاید آپ کا اشارہ محبت کی طرف ہے"

وہ کسی جھجک یا کمتری کے احساس میں مبتلا ہوئے بغیر کہنے لگیں جیسے برابر کے آدمی سے مخاطب ہوں "میں بہت فرینک اور پریکٹیکل ہوں۔ مجھے کہنے دیجیئے کہ محبت کرنے کے لیئے شادی .... کرنا شرط ہو تو ہو۔ مگر شادی کرنے لئے پہلے سے محبت کرنا کوئی شرط نہیں۔ ویسے مجھے انکار نہیں ہونا چاہیئے کہ جو جذبہ آپ کے دل میں ہے وہی کم از کم پسند کی حد تک میرے دل میں بھی ہے۔

مگر سلمہ صاحبہ، ذرا سوچیئے تو کہ میری اور آپ کی کیسے نبھے گی میری گفتگو کا انداز سیدھا سادہ ہے مختصر اور صاف باتیں کرتا ہوں۔ جنھیں

سمجھنے کے لئے ذہن پر زور نہ دینا پڑے۔ مگر آپ کا انداز گفتگو تو ایک دم پارلیمنٹری ہے۔

خیر چھوڑیئے ان باتوں کو۔ میں سیریس ہوں۔ ہاں یا نہیں میں جواب دیجئے۔"

"لیجئے —— ہاں، مگر آپ گریجویشن تو کر لیجئے۔ پھر آپ کے والدین بھی تو ہیں۔"

"وہ میں سمجھ لوں گی۔ انھیں اعتراض بھی کیا ہو سکتا ہے اور گریجویشن تو کرنا ہی ہے۔" پھر ذرا مسکرا کر اور اچانک موڈ بدل کر کہنے لگیں، "سر کیسی عجیب بات ہے ہم بدنام پہلے ہوئے اور رومان اب شروع ہوا ہے۔"

قبل ازیں کہ پروفیسر کچھ کہے پھر سلمہ ہی بولیں۔ مگر نظر جھکا کے اور شرمیلے لہجے میں "آپ کی شاعری کو مجھ سے دشمنی ہی تھی۔ مجھے مار کر ہی دم لیا۔ جیسے خون کی پیاسی رہی ہو۔"

"مگر آج کی یہ ملاقات ہرگز ان ساری باتوں کا ثبوت نہیں جیسے ہمارے درمیان کوئی سیاسی معاہدہ ہو رہا ہے۔"

"یہ عشق نہیں شادی کا معاملہ ہے۔ میں بہت فرینک اور پریکٹیکل ہوں۔ عاشقانہ عہد و پیمان اور حقیقت میں بیر ہوتا ہے۔"

"اتنی کم عمری میں آپ کی فکری پختگی حیرت انگیز ہے۔"

"واقعی میری عمر ہی کیا ہے۔ مگر میں شروع سے ہی صاف گو اور

حقیقت پسند ہوں "

دو شریفوں کے عہد و پیمان پر یہ ملاقات ختم ہوئی۔

دن گذرے ــــ مہینے گذرے پروفیسر نے خاندان والی لڑکی سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ سلمہ صدیقی نے بی اے کر لیا اور ایک بار پھر معاہدہ کی تجدید ہوئی۔ والدین سے زبانی کہنے کی ہمت تو نہ ہوئی۔ البتہ سلمہ نے خط لکھ کر انھیں اپنی شادی کی طرف متوجہ کیا اور پروفیسر ہاشمی کے سلسلے میں نہ صرف اپنی پسند بلکہ اپنے فیصلہ سے بھی انھیں صاف صاف آگاہ کر دیا۔

مگر انھیں اس گستاخی اور جرأت کی داد نہ مل سکی۔ والدین نے اس پسند اور خواہش کا احترام نہیں کیا جو افواہیں اُن کے کانوں تک پہنچتی رہی تھیں ان پر اب یقین آگیا اور انہوں نے سمجھ لیا کہ لڑکی اب تک ناموس کو رسوا کرتی رہی تھیں۔ ایک چڑ سی پیدا ہو گئی اور انھوں نے صاف انکار کر دیا۔

وہ چاہتے تھے کہ سلمہ تعلیم جاری رکھیں یا اگر چھوڑیں بھی تو والدین کی مرضی اور پسند سے شایان شان شادی کریں۔ پروفیسر کے والدین نے پہلے ہی بیزاری اور بے تعلقی کا اعلان کر دیا تھا۔ خاندان والی منگنی ٹوٹ جانے سے سبکی اور بدنامی ہو گئی تھی جس کا داغ وہ دل میں لئے بیٹھے تھے۔

مگر مخالفتوں کے باوجود دونوں نے شادی کر لی "

پہلے عدالت میں قانونی شادی کرلی۔ اس کے بعد دونوں نے شرعی نکاح کر کے زن و شو کی زندگی شروع کی دونوں اپنے گھر خاندان کو چھوڑ کر شہر کے ایک دور افتادہ گوشے میں فلیٹ لے کر بس گئے۔ سلمہ صدیقی شادی کے بعد سلمہ ہاشمی کہلانے لگیں۔ بی ٹی کی ٹریننگ کر کے انھوں نے بھی لڑکیوں کے ایک اسکول میں ملازمت کرلی۔ سلمہ اپنے شوہر کی شاعری اور زندگی کا سنگار بن گئیں۔

لیکن شادی کے تین سال بعد ہی سلمہ ہاشمی بیوہ ہوگئیں۔

زہرہ پیدا ہو چکی تھی۔ دو سال کی عمر رہی ہوگی۔ ٹرافک کے سنگین حادثے میں پروفیسر ہاشمی کی موت واقع ہوگئی۔ بیگم سلمہ ہاشمی زندگی کی لق و دق شاہراہ پر تنہا رہ گئیں۔ انھیں اسکول سے صرف ڈیڑھ سو روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ مگر شوہر کی وفات کے بعد انھیں انشورنس کمپنی سے خاصی بڑی رقم ملی اور اس رقم سے انھیں نئی زندگی شروع کرنے اور سنوارنے میں بڑی مدد ملی۔

اس سانحہ نے سلمہ بیگم کی زندگی کو کڑی آزمائش میں ڈال دیا بھری جوانی کی بیوگی کا سوگ اٹھانا کچھ آسان نہ تھا۔ اس سانحے سے رشتہ داروں سے لے کر شناساؤں تک ہر کسی کا دل ہل گیا تھا۔ پروفیسر ہاشمی کی المناک جواں مرگی نے دونوں طرف کے مربیوں کا نہ صرف غصہ ٹھنڈا کر دیا بلکہ سلمہ اور زہرہ کے لیے ان کے دلوں میں ہمدردی اور محبت کا طوفان جاگ اٹھا۔ میکہ اور سسرال والوں نے بہت سمجھایا بہت منایا خوشامدیں کیں اور معافی تک مانگی مگر سلمہ بیگم ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ انھیں مستقبل کے نشیب و فراز سے آگاہ کیا گیا انھیں ڈرایا گیا کہ ان کی عمر خاندان سے الگ

یا تنہا رہنے کی نہیں تھی حفظ و امان کے لئے انھیں خاندان کے سہارے کی ضرورت تھی۔ مگر کچھ پیش نہ گئی۔ وہ کسی قیمت پر واپس جانے کو تیار نہ ہوئیں۔ انھیں ان سب سے نفرت ہو چکی تھی شادی کے معاملے میں دونوں خاندانوں سے انھیں جو تلخ تجربہ ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے ان کے دل میں آگ بھری ہوئی تھی۔ میکہ اور سسرال والوں کی خواہش تھی کہ وہ اسکول کی ملازمت ترک کر کے گھر بیٹھ جائیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں زہرہ کے ذرا بڑی ہو جانے پر انھیں دوسری شادی تو کرنی ہی تھی۔ اس عمر کی عورت کے خاندان سے باہر رہ کر تن تنہا زندگی گزارنے میں ناموس کو بٹہ لگنے کا اندیشہ تھا۔ مگر سلمیٰ نے دو ٹوک جواب دے دیا۔ "میں آپ لوگوں کے جسم کا سڑا ہوا گوشت ہوں۔ جسے آپ لوگوں نے کاٹ کر پھینک دیا۔ اب یہ سڑا گوشت آپ لوگوں کے پاک جسم کا حصہ نہیں بن سکتا۔ میں آپ لوگوں کی کوئی نہیں۔ میں اپنے نیک و بد کی خود مالک ہوں۔ اور اپنے دکھ سکھ کی خود ذمہ دار ہوں۔ آپ لوگوں کی ہمدردی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔"

خاندان والوں نے مایوس ہو کر سلمیٰ بیگم سے صبر کر لیا۔

سلمیٰ بیگم نے اپنے آپ کو مار کر زہرہ کے لئے جینا شروع کر دیا۔ بڑی خاموش اور پرسکون زندگی گزارنے لگیں۔ گھر سے اسکول قریب ہی تھا۔ دن میں ایک بار کبھی حسنی بوا زہرہ کو لئے اسکول پہنچ جاتی تو کبھی وہ خود دوپہر کو ایک بار گھر آ کر زہرہ کو دیکھ جاتیں۔ بہت چھٹپن ہی سے انہوں نے زہرہ کی تعلیم و تربیت پر دھیان دینا شروع کر دیا تھا۔ انھیں ایسا محسوس ہونے لگا

کر ان کی روح زہرہ میں حلول کر گئی تھی۔ اور اب زہرہ کے روپ میں نئے سرے سے اپنی زندگی شروع کر رہی تھیں۔

زندگی بالکل میکانکی ڈھنگ سے گزر رہی تھی اور شاید میکانکی زندگی کی رفتار کچھ تیز ہوا کرتی ہے۔ اس ڈھنگ سے جیتے ہوئے دیکھتے ہی دیکھتے گیارہ سال گزر گئے اور زہرہ نے صرف تیرہ سال کی عمر میں انھیں کے اسکول سے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور اتنی کمسنی ہی میں وہ کالج کی سیانی لڑکیوں میں جا بیٹھی جہاں سب اسے بے بی کہہ کر پکارنے لگے۔ اسی سال بیگم سلمہ ہاشمی کو ترقی بھی ملی۔ ان کے اسکول کی ہیڈ مسٹریس ریٹائر ہوئیں اور وہ ہیڈ مسٹریس بنا دی گئیں۔

تین چار سال ـــــ میکانکی زندگی کے تین چار سال اور گزرے اور اب بے بی سیانی ہو کر مس زہرہ ہاشمی کہلانے لگی ہے چند ہی مہینوں بعد وہ بی اے پاس کرنے والی ہے۔ جوں جوں ان کے سن و سال چڑھتے ہیں۔ ماں کے کلیجہ میں ہوک سی اٹھتی رہتی ہے۔ ماں کا دل کہتا ہے کہ زہرہ ہاشمی سدا بے بی ہی رہ جاتی۔ ماں مر جاتی۔ ماں مر جاتی تب سیانی ہوتی۔ اور زہرہ ہے کہ جوں جوں سیانی ہوتی جاتی ہے ماں کی آغوش رحمت سے گریزاں اور اس کے آنچل کے سایہ سے باہر ہوتی جاتی ہے۔

آج تو اس نے حد ہی کر دی رات کے ساڑھے نو بجنے کو آئے مگر اس کا پتہ نہیں، ماں کا جی ڈرتا ہے۔ عمر ایسی ہے جب سورج کی دھوپ سے زیادہ چاند کا اجالا۔ دل کو بھاتا ہے۔ چاند کے اجالے میں حسن اور ٹھنڈک سہی۔

مگر دھندلا ہوتا ہے۔ ٹھیس لگ سکتی ہے۔ ٹھیس لگنے سے کانچ کا وہ نازک اور حسین کھلونا جو ہر کنواری لڑکی کی امانت میں رہتا ہے گر کر ٹوٹ سکتا ہے۔ ماں کا دل ہی تو ہے طرح طرح کا خیال ستنا یا کرتا ہے۔ انتظار کرتے کرتے ماں کی آنکھیں پتھرا گئیں اور سو گئیں۔ ماں نے چائے نہیں پی۔ کچھ کھایا نہیں اب تو کھانا بھی ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ حسنی بُوا بار بار کمرے میں آتی جاتی رہی۔ ہر مرتبہ بیگم صاحبہ کو آنکھیں بند کئے پایا مگر اب تو انتظار کی حد ہو چکی تھی۔ حسنی بوا بھی سوچنے لگی کہ چھوٹی بی بی کے یہ لچھن اچھے نہیں۔ اسے بیگم صاحبہ پر رہ رہ کر ترس آرہا تھا۔ پلنگ کے پاس جاکر اس نے دھیرے سے کہا۔ "بیگم صاحبہ کھانا"، مگر انھیں نیند آگئی تھی۔ بُوا نے دیکھا کہ ان کی کنپٹی میں آنسو کی ایک لکیر خشک ہو گئی ہے۔

اسی لمحے چوکھٹ سے باہر کسی کے قدموں کی آہٹ ہوئی۔ بُوا نے لپک کر دیکھا تو چھوٹی بی بی آگئی تھی۔ اس نے بیگم صاحبہ کی پریشانی اور بیقراری کا حال سنا دیا۔ زہرہ کی سرزنش کی گود کی کھیلی ہوئی تھی۔ اس لئے زہرہ حسنی بُوا سے سب کچھ کہدیتی تھی۔ زہرہ کا چہرہ کچھ روہان ہو گیا۔ وہ ننگے پاؤں دبے قدموں ماں کے پلنگ تک گئی۔ واقعی کنپٹی کے قریب آنسو کی ایک خشک لکیر پڑی ہوئی تھی۔ زہرہ کا جی کوک اٹھا اور وہ آہستہ سے سانپ کی طرح رینگ کر ماں کے پہلو میں لیٹ گئی۔ چھاتی سے لگ کر اپنا ایک گال اس کے ہونٹ سے مس کر دیا۔ ماں کی آنکھ کھل گئی اس نے بیٹی کو ننھی منی کی طرح گھستے پایا تو رحمت و شفقت کا دریا متلاطم ہو گیا۔

زہرہ اپنی ماں کی کمزوری جانتی تھی۔ وہ ماں کی گردن میں چہرہ چھپائے سسک کے بولی "بڑی غلطی ہوئی۔ پھر کبھی ایسا نہ ہوگا" سلمیٰ بیگم کو محسوس ہوا جیسے ان کی چھاتیوں میں دودھ اتر آیا ہو۔

بادل برس گئے مطلع صاف ہوگیا۔

کھانے کی میز پر زہرہ نے خود بخود بتایا کہ وہ ایک لڑکے کے ساتھ پکچر دیکھنے چلی گئی تھی۔"

"کیا اس کا نام منصور صدیقی ہے؟"

سلمیٰ بیگم نے چور پکڑ لینے کے انداز میں کہا۔ زہرہ کا جی دھک سے ہوا اور اٹھا ہوا نوالہ منہ کے قریب رک گیا۔ ماں کے سوال سے کترا کر اس نے پوچھا "امی میرا کوئی خط آیا ہے؟"

"ہاں میز پر پڑا ہے۔
میں نے پڑھ لیا ہے۔"

زہرہ خاموش رہی۔

سلمیٰ بیگم نے کچھ توقف کر کے کہا "تم تو کافی سمجھ دار ہو۔ مگر کچھ اونچ نیچ ایسی بھی ہوتی ہے جو عمر پاکر ہی سمجھ میں آتی ہے۔ کسی لڑکے سے تمہارا آزادانہ ملنا جلنا بڑی نازک اور ذمہ داری کی بات ہے چاہے بات کچھ بھی ہو مگر انگلیاں اٹھنے لگتی ہیں۔ لڑکوں کا کچھ نہیں بگڑتا مگر کچھ مشہور ہو جاتا ہے تو لڑکیوں کو بہت بھگتنا پڑتا ہے۔ شادی بیاہ کو لے کر۔"

زہرہ نے سوچا تھا کہ ماں پوچھے گی ——— یہ منصور صدیقی کون ہے؟

——— مگر بات یہیں ختم ہو گئی۔ سلمیٰ بیگم نے اس سے آگے نہ کچھ کہا نہ کچھ پوچھا۔

اس واقعہ کے بعد زہرہ نے کالج سے واپس آنے میں پھر کبھی دیر نہ کی۔ مگر سلمیٰ بیگم نے دیکھا کہ وہ کبھی کبھی اداس ہو جاتی تھی۔ کسی کسی وقت کھوئی کھوئی نظر آتی۔ ماں کو شک گزرا کہ لڑکی دل پر چوٹ کھا گئی ہے یا کوئی بات شاق گزری ہے۔ اس نے بیٹی سے تو کوئی ٹوہ نہ لی مگر چپکے چپکے اس لڑکے کی جستجو کرتی رہی جس کا نام منصور صدیقی تھا مگر عرصہ تک اس کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔

پھر زہرہ کے امتحانات کے دن آ گئے۔

انھیں دنوں ایک شام ایسا ہوا کہ سلمیٰ بیگم کے فلیٹ پر ایک نوجوان نے دستک دی۔ نکلتا ہوا قد، مسکین صورت اور شرمیلی آنکھیں وہ نوجوان سلمیٰ بیگم کو دیکھتے ہی بوکھلا گیا۔ جلدی سے بولا "کیا زہرہ ہاشمی یہیں رہتی ہیں؟ میں بیگم سلمیٰ ہاشمی سے ملنا چاہتا ہوں"۔ — مگر فوراً اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ بے چارہ گڑبڑا کر الٹا بول گیا تھا۔ سلمیٰ بیگم اس کی بوکھلاہٹ کو بھانپ کر مسکرا پڑیں اور پورے وثوق کے ساتھ سمجھ گئیں کہ آنے والا کون تھا۔

بڑی بے ساختگی اور وہی چور پکڑنے والے انداز سے بولیں "آؤ برخوردار آؤ۔ مجھے کب سے تمہاری تلاش تھی"۔

سلمیٰ بیگم کے اس دھڑلے پن کے اندازِ تخاطب پر نوجوان کی سٹی گم ہو گئی، ویسے وہ سلمیٰ بیگم کو پہچانتا ہی تھا۔ اور اس فلیٹ سے بھی اس کی غائبانہ واقفیت تھی، وہ سلمیٰ بیگم کے سامنے مودب اور مرعوب بیٹھا رہا۔

نظر جھجک رہی تھی۔ زہرہ دوسرے کمرے میں تھی۔ سلمہ بیگم نے نوجوان کو اپنا مدعا بیان کرنے کی بھی مہلت نہیں دی۔ خود ہی بولیں "اگر میرا قیاس خطا نہیں کر رہا ہے تو آپ ہی وہ منصور صدیقی ہیں، جو لڑکیوں کو خط لکھ کر کتاب لینے کے لئے بلایا کرتے ہیں۔"

"جی ــــ جی ــــ" نوجوان جھرجھرا اُٹھا۔ حلق میں سانس پھنسی ہوئی محسوس کرنے لگا۔ پھنسی ہوئی سانس کو پانی کی طرح نگل گیا۔ گلا صاف کیا اور بدحواسی کے عالم میں اچک کر کھڑا ہو گیا۔ بولا "معاف کیجئے گا میں غلط جگہ آ گیا۔"

سلمہ بیگم منہ پھیر کر مسکرائیں اور اس کی طرف رُخ کر کے بولیں "جگہ بھی صحیح ہے اور آپ نے جو نام لئے ہیں وہ بھی صحیح ہیں۔ آپ کو ملنا کس سے ہے؟ سلمہ ہاشمی آپ کے سامنے ہے اور زہرہ ہاشمی دوسرے کمرے میں ہیں۔

نوجوان خود بخود پھر بیٹھ گیا۔ اور پتلون کی جیب سے رومال نکال کر پسینہ پونچھنے لگا۔ ہمت اور حواس بجا کر کے بڑی کاوش کے بعد بول سکا۔ ــــ میں دراصل زہرہ ہاشمی سے ملنا چاہتا ہوں۔ آپ سے بھی ملاقات ہو گئی۔ تو یہ میری ہی خوش قسمتی ہے۔

سلمہ بیگم نے محسوس کیا کہ لڑکا تربیت یافتہ ہے دل نے کہا سلمہ کی بیٹی ایسوں ویسوں کو آنکھ لگا بھی کہاں سکتی ہے۔"

" تو گویا آپ ہی منصور صدیقی ہیں؟"

"جی خاکسار ہی کو کہتے ہیں۔" پھر ذرا جھینپتے ہوئے بولا "آپ کا یہ خیال غلط ہے کہ میں لڑکیوں کو خط لکھا کرتا ہوں۔ صرف ایک خط لکھا تھا۔

مس زہرہ ہاشمی کو۔ وہ بھی مجبوری میں۔"

"پکچر اکیلے بھی دیکھی جا سکتی ہے۔"

"یہ کوئی مجبوری نہیں۔"

حالاں کہ خط لکھنے سے پہلے ہی دونوں کی "اتفاقاً" ملاقات ہو گئی تھی

"جی نہیں۔ دراصل ایک کتاب دینی تھی پکچر کا پروگرام تو یونہی بن گیا تھا۔"

"زہرہ سے آپ کی جان پہچان کیسے ہوئی؟"

"جی ان کی ایک گرل فرینڈ ہیں شمیم آرا میری رشتہ دار ہیں۔ میرا آنا جاتا ہے ان کے ہاں وہیں ان سے ملاقات ہوئی کئی بار ملاقات ہوئی۔

"اور محبت ہو گئی"

"جی نہیں"

"دوستی ہو گئی"

"جی نہیں۔ تو پھر دشمنی ہو گئی؟"

سلمیٰ بیگم کے دل نے کہا۔ لڑکا ذہین اور صحبت یافتہ معلوم ہوتا ہے۔ پھر اس سے مخاطب ہوئیں۔ "آپ کرتے کیا ہیں؟"

"پڑھتا ہوں۔ ففتھ ایئر ایم اے ہے۔"

"اور بھی کچھ کرتے ہیں آپ؟"

"میرا مطلب ہے کوئی شوق۔ کوئی ضمنی شغل۔"

"جی ہاں۔ افسانے لکھتا ہوں۔"

"افسانے؟"

"جی ہاں۔ کبھی کبھی لکھ لیتا ہوں۔ ویسے مجھے لکھنا دکھنا آتا نہیں بس ایک شوق ہے۔"

"زہرہ ہاشمی پر بھی کوئی افسانہ لکھا؟"

"جی؟"

"زہرہ ہاشمی پر کوئی افسانہ لکھا آپ نے؟" منصور نے پھر پتلون کی جیب سے رومال نکال کر پسینہ پونچھا "جی نہیں ——— جی ہاں۔ مگر کچھ خاص تو نہیں ——— ایک افسانہ لکھا تھا۔

"شمیم کہتی تھیں کہ اس کا ایک کردار مس زہرہ سے ملتا تھا۔"

"اس کے بعد ہی آپ دونوں میں کتابوں کا تبادلہ ہو گیا۔

منصور کا جی چاہا کہ بھاگ نکلے۔ مگر ہمت نہ پڑی۔ بڑی دبنگ عورت سے پالا پڑا تھا۔

"کچھ ٹھیک یاد نہیں" منصور کو بولتے ہی بنی۔

"آج یہاں تک کیسے زحمت کی آپ نے؟"

یہ تو منصور بھول ہی گیا تھا۔ اس نے ذہن پر زور دے کر کہا۔

"کوئی ضرورت تو نہ تھی۔ یونہی چلا آیا تھا۔ کافی دنوں سے ملنا نہیں ہوا۔ یہ شمیم کے گھر بھی نہیں گئیں۔ کچھ الجھن سی ہوئی کہ بات کیا ہے۔ اِدھر اُدھر ملنا کچھ خراب سا لگا۔

سوچا گھر ہی چل کر مزاج پرسی کر لوں۔"

"بڑی ہمت والے ہیں۔"

"یہ ہمت صدقہ ہے۔ مس زہرہ کے اور آپ کے بلند کردار کا۔"

"آپ خط بھی تو لکھ سکتے تھے۔"

"وہ تو سوچا تھا مگر اس بہانے آپ سے بھی ملنے کی خواہش تھی۔ میں نے باہر تو

آپ کو بارہا دیکھا ہے۔ آپ سے واقف بھی ہوں۔ بڑا اشتیاق تھا۔ مجھے آپ سے ملنے کا۔ مس زہرہ سے آپ کے بارے میں بہت کچھ سن چکا ہوں۔ میرے دل میں آپ کی عظمت اور توقیر ہے۔ مجھے تو اس بات پر بھی ناز ہے کہ وہ لڑکی میری دوست ہے جس کی آپ ماں ہیں۔"

"بس بس صاحبزادے" سلمیٰ بیگم نے بریک لگائی۔ ثابت ہو گیا افسانہ نگار ہو۔ مگر کسی کو ماں بنانے کے لئے بے تحاشہ تعریفوں کے پل باندھنے کی ضرورت نہیں۔ کہیں اس ملاقات پر کوئی افسانہ نہ لکھ دینا۔ جیسی کہ تم لوگوں کی عادت ہوتی ہے۔"

زہرہ پردے کے پیچھے کھڑی سب کچھ سن رہی تھی۔ وہ انجانے میں چوکھٹ پر اسی وقت آئی جب ماں نے کہا تھا "تو گویا آپ ہی منصور صدیقی ہیں؟"—— منصور صدیقی کا نام سن کر وہ وہیں ٹھٹھک کر رہ گئی تھی۔

"اچھا ٹھہرو" سلمیٰ بیگم کا اس کے مدعا کی طرف دھیان پلٹا "زہرہ کو بلائے دیتی ہوں۔ مگر ایک بات ہے تم افسانہ نگار ٹھہرے، وہ بات آسانی سے سمجھ سکو گے۔ کسی لڑکی سے ملنا جلنا تو قابل اعتراض نہیں ہے۔ کم از کم میں قابل اعتراض نہیں سمجھتی مگر ہم جس سماج رہتے ہیں وہ کچھ قابل اعتماد نہیں ہے تنگ دل اور تنگ نظر ہے۔ اس کے کچھ کڑے ضابطے ہیں ان ضابطوں میں ابھی صرف اتنی لچک پیدا ہو سکی ہے کہ لڑکوں کے ساتھ لڑکیاں پڑھ سکتی ہیں دونوں کا ساتھ گھومنا ابھی تک آوارگی ہی میں شمار ہوتا ہے اگر تم دونوں کا ملنا جلنا مشہور ہو جائے تو رفتہ رفتہ یہ شہرت بدنامی میں بدل جائے گی اور ہمارا سماج ابھی تک اتنا وحشی ہے کہ بدنام صرف لڑکی ہوتی ہے۔

منصور نے جیسے پہلے ہی سے سوچ رکھا تھا۔ برملا جواب دیا:۔
"آپ پریشان نہ ہوں۔ اگر ایسا وقت آیا تو ہم فوراً شادی کرلیں گے وہ مجھے ناپسند نہیں کریں گی۔ ویسے میں کسی اعتبار سے ہیٹا تو نہیں۔"

سلمہ بیگم لڑکے کی جسارت پر دنگ رہ گئیں، مگر وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکیں۔ طنز سے بولیں۔

"گویا تم اپنا رشتہ طے کرنے آئے ہو۔ سعادت مند اولاد اسی طرح والدین کا ہاتھ بٹانے لگتی ہے۔"

مگر لڑکا بھی ایک ہی ڈھیٹ نکلا کہنے لگا: "مگر بعض اوقات خوش قسمت والدین اس زحمت سے بچ بھی تو جاتے ہیں۔ بیٹھے بٹھائے کسی کو بہو کسی کو داماد مل جاتا ہے۔"

سلمہ بیگم کچھ سٹ پٹا گئیں، معاً انھیں اپنا قصہ یاد آگیا۔ آگے کچھ کہنے کی گنجائش نہ پاکر دروازے کی طرف منہ کرکے پکارا۔

"بوا ذرا چھوٹی بی بی کو بھیجنا۔"

زہرہ پردہ ہٹا کر کمرے میں داخل ہوگئی سلمہ بیگم کو فرار کا بہانہ مل گیا۔ معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ زہرہ سے مخاطب ہوئیں: "ان سے ملو — آج خط لکھنے کے بجائے خود ہی زحمت کر بیٹھے ہیں۔ بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔"

زہرہ نے کچھ نہ کہا رسماً مسکرائی بھی نہیں بس سست قدموں سے چل کر کرسی پر جا بیٹھی منصور کو معترض نظروں سے دیکھا۔ باتیں وہ

سن ہی چکی تھی۔ یہ جسارت اور شوخ گفتگو اسے کچھ بھائی نہیں وہ بڑے محتاط اور مہذب کردار کی لڑکی تھی۔ منصور نے پہلی ہی ملاقات میں سارا بھرم کھول کر رکھ دیا تھا۔ دل میں آیا ـــــ اب ماں کیا کیا نہ سوچے گی۔"

سلمہ بیگم اٹھ کھڑی ہوئیں "میں چائے بھجواتی ہوں، تب تک باتیں کرو۔"

"کیا خاک باتیں ہوں گی۔"

زہرہ بے دلی سے بولی۔

"امتحان سر پر ہے"

جب سلمہ بیگم باہر نکل گئیں تو اُس نے منصور سے کہا "میں نے سب کچھ سُن لیا ہے۔ آپ کو ماں سے ایسی باتیں نہ کرنی تھیں۔ میری ماں کو آپ نے صرف جنا ہے۔"

"جانا نہیں"

منصور نے کہا "معاف کیجیئے گا، میں آپ کی طرح گھُنّا نون غنّہ تو ہوں نہیں۔ دل کی بات زبان پر آ ہی گئی تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑی۔ پھر بھی میرا ارادہ ان سے اس قسم کی گفتگو کرنے کا نہ تھا۔ مگر کیا بتاؤں عجب انداز گفتگو ہے ان کا ایکسرے کر کے رکھ دیتی ہیں۔ ذرا بھی سوچنے کا موقع نہ دیا یقین مانئیے حلق میں ہاتھ ڈال ڈال کے پیٹ کی بات نکالی ہے۔

"آپ میرے گھر آئے ہیں یہ کسی کے لیے بھی عزت کی بات ہو سکتی

ہے۔ مگر ابھی آپ نہ آئے ہوتے تو اچھا تھا۔ اب امّی کئی روز تک بیمار بیمار سی نظر آئیں گی۔ وہ ہر اس بات کی دشمن ہیں جو میرے اور ان کے درمیان حائل ہونے والی ہو۔ میں جو سیانی ہو گئی ہوں ـــ اب کیا عرض کروں آپ کو ہنسی آئے گی۔ کہ یہ ماں بیٹی زمانے سے نرالی ہیں ذرا حسنی بُوا سے پوچھ دیکھئے۔ دنیا میں بیٹیاں ہوتی ہیں تو ماں کے دل کے کنول کھلتے ہیں۔ مگر ہائے میری امی ہیں جوں جوں کِھلتی ہوں وہ مرجھاتی ہیں وہ سمجھتی ہیں کہ میری عمر میں ایک دن بڑھتا ہے تو میرے اور ان کے درمیان ایک قدم کا فاصلہ بڑھ جاتا ہے۔ اگر ان کے بس میں ہوتا تو پھر سے مجھے دودھ پلانا شروع کر دیتیں اور پنگوڑے میں جھلایا کرتیں "۔

منصور واقعی ہنسنے لگا: "پھر تو آپ کی والدہ صاحبہ کو اس کا بھی ملال ہوگا۔ کہ آپ کی پیدائش کیوں ہوئی۔

زہرہ چپ تو ہو گئی مگر وہ کبھی کبھی والا تبسم ہونٹوں پر مچلتا رہا۔

کچھ اور باتیں ہوئیں۔ چائے آئی۔ پھر سلمہ بیگم آ گئیں۔ وہ دل ہی دل میں سوچتی رہیں کہ ماں کو شاعر سے پالا پڑا تھا۔ بیٹی افسانہ نگار کے چکر میں پڑ گئی تھی۔ اس کے بعد بھی منصور نے دو تین بار سلمہ بیگم سے گھر پہنچ کر ملاقات کی اس نے اپنی چاپلوسی اور عقیدت مندانہ ستائش سے انھیں نیم راضی کر لیا تھا۔ اپنے آپ کو زہرہ کے قابل ثابت کر دیا تھا۔

زہرہ نے بی اے پاس کر لیا۔

ایک دن ایک صاحب تشریف لائے۔ اجنبی تھے ادھیڑ عمر کے خوش وضع آدمی تھے لباس اور شباہت سے خاصے مہذب اور تعلیم یافتہ معلوم ہوتے تھے۔ کلین شیو تھا شکل کافی اچھی تھی، رنگ گندمی اور بال کالے تھے۔ جسمانی ساخت اور قد و قامت سے پولیس کے افسر معلوم ہوتے تھے۔ کنپٹی کے دو چار بال سفید ہو چکے تھے۔ سلمہ بیگم کی جامع گمبھیر شخصیت سے ذرا بھی مرعوب و متاثر نظر نہیں آئے اس۔ بے تکلفی سے بیٹھے تھے جیسے ہر روز کا آنا جانا ہو۔ وہ خود ہی چھا جانے والی شخصیت رکھتے تھے۔ سلمہ بیگم کو کیا خاطر میں لاتے۔

کمرے میں داخل ہونے سے لے کر کئی منٹ بیٹھ جانے کے بعد تک انھوں نے نہ کوئی رسمی بات کی اور نہ عرض مدعا کی تمہید کی۔ بلکہ گفتگو اچانک اس بات سے شروع کی۔ کچھ دنوں سے میرے گھر میں آپ کی لڑکی کا بڑا چرچا ہے۔ شاید زہرہ ہاشمی یا ایسا ہی کچھ نام ہے۔ عورتوں کا خیال ہے کہ رشتہ اچھا رہے گا۔

سلمہ بیگم بھونچکا سی رہ گئیں۔ ذرا کڑوی ہو کر اعتراض کے لہجے میں بولیں۔

"مگر جناب آپ ہیں کون؟

"اوہ یہ بتانا تو میں بھول ہی گیا۔

ان صاحب نے اپنی غلطی محسوس کی۔

"معاف کیجیے گا۔ میں منظور احمد صدیقی ہوں ۔ منصور صدیقی کا باپ۔ میں نے سوچا بیٹے کو جانتی ہیں تو باپ کو بھی جانتی ہی ہوں گی۔"

یہ سُن کر زہرہ ان صاحب کو ترچھی نظر سے دیکھتی اور ان کے بے تحاشہ پن پر مسکان بکھرتی ہوئی کمرے سے باہر کھسک گئی اور دل ہی دل میں سوچتی رہی کہ حضرت کی خیر نہیں۔ کیونکہ اس کے خیال میں ان صاحب نے اتنی بے دھڑک گفتگو کر کے بدتمیزی کا مظاہرہ کیا تھا۔ جو سلمہ بیگم کی نازک شائستگی کو مجروح کرنے کے لیے بہت تھا۔ نہ تعارف نہ تمہید۔ دھڑ سے ایک پہاڑ سی بات کہہ دی۔

مگر زہرہ کا خیال غلط نکلا۔ سلمہ بیگم تو سوچنے لگیں ـــ یہی ہے میرے لئے دشمنی پیدا کرنے والا! ـــ پھر ذرا بے نیازی سے کہا۔ "تو آپ رشتہ مانگنے آئے ہیں؟"

"جی ہاں ۔ کچھ ایسی ہی بات ہے۔"

"مگر میں ایسا محسوس کر رہی ہوں کہ آپ رشتہ مانگنے نہیں گاجر مولی خریدنے نکلے ہیں۔"

سلمہ بیگم نے چوٹ کی۔ "اور ہم نے تو سنا ہے کہ گھر میں آپ باپ بیٹے کے علاوہ تیسرا کوئی نہیں۔"

"جی ہاں"

"آنے والی بہو کے لئے خیریت ہی ہے ساس یعنی بہوؤں کے دل کا کانٹا وہاں پہلے ہی سے نکلا ہوا ہے۔"

"مگر آپ تو کہتے ہیں کہ گھر میں میری لڑکی کا بڑا چرچا ہے اور عورتیں کہتی ہیں کہ رشتہ اچھا رہے گا۔"

"باہر کے لوگ گھر پہنچ کر چرچا کرتے ہیں۔ اور رشتہ دار عورتیں کھچڑی پکایا کرتی ہیں ورنہ گھر میں تو ہم دونوں ہی ہیں اور دو نوکر۔ میں نے سوچا لڑکے کی تو شادی کرنی ہی ہے۔ گھر خاندان اچھا ہے۔ پھر کیوں نہ مل کر بات صاف کرلی جائے۔ لڑکے کا دل بھی رہ جائے گا اور میرا بوجھ اتر جائے گا۔

مگر رشتہ کی باتیں اس طرح آناً فاناً میں طے نہیں ہوا کرتیں۔ سوچ بچار کی ضرورت پڑتی ہے۔

اچھا تو پھر سوچ بچار کر لیجئے۔ جب کہئے حاضر ہو جاؤں"۔

یہ کہہ کر منظور صدیقی جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

اور ہاں کچھ ضروری باتیں آپ کے گوش گذار کر دوں۔ میں ایک گزیٹڈ آفیسر ہوں۔ ساڑھے سات سو روپے تنخواہ پاتا ہوں۔ ایم اے تک پڑھا ہوں۔ شہر میں اپنا مکان ہے۔ لوگ شرفا میں شمار کرتے ہیں۔ خاندان میں کوئی داغ دھبہ نہیں۔ رشتہ طے ہو جانے پر شادی فوراً کرنی ہوگی۔ دھوم دھڑکا نہیں ہوگا۔ لین دین کی شرط نہیں۔ لڑکی کو مذہبی تہذیب کی زندگی گذارنی ہوگی کسی ملازمت یا مشغولیت کی اجازت نہیں ہوگی۔ جو گھریلو زندگی میں حارج ہو۔ دیوار اور نقاب والے پردے کا میں قائل نہیں اس کی انحصار عورت کی اپنی شرم و حیا پر سمجھتا ہوں

ان تمام باتوں کو ذہن میں رکھ کر فیصلہ کیجیے۔ لڑکی پسند کرنا لڑکے کا کام تھا باقی ذمہ داری میری ہے۔ اور لڑکے کو تو آپ شاید جانتی ہی ہوں گی۔"

سلمہ بیگم نے کچھ کہنا چاہا مگر صدیقی صاحب اس کا موقع دیئے بغیر تیزی سے باہر نکل گئے۔ وہ سوچنے لگیں ـــــ عجیب آدمی ہیں چائے تک کو پوچھنے کا موقع نہیں دیا۔

زہرہ کی شادی کی بات نے سلمہ بیگم کو بڑی کشمکش میں مبتلا کر دیا۔ شادی تو بہر حال کرنی ہی تھی۔ اب ان کے دامن کی وسعت اتنی بڑی لڑکی کو چھپانے سے قاصر تھی۔

مگر اس خیال سے بھی کلیجہ منہ کو آنے لگتا تھا کہ وہ تنہا رہ جائیں گی۔ پھر ان کے کرنے کو کیا رہ جائے گا۔ وہ کس کے لیے جیئیں گی۔ ایک دبی دبی خواہش ان کے دل میں یہ بھی تھی کہ جس سے زہرہ کی شادی ہو وہ گھر داماد بن کے رہے۔ بس منصور کے بارے میں یہی ایک بات پوچھنے کو باقی تھی۔ مگر صدیقی صاحب بھی ایک ہی کائیاں آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کو بھی تو وہی مجبوری تھی جو سلمہ بیگم کو تھی۔ صدیقی صاحب نے بھی عین عالم جوانی میں رنڈوے ہونے کے بعد زندگی کی بعض بنیادی مسرتیں بیٹے کی پرورش اور تعلیم و تربیت پر قربان کر دی تھیں۔ اب ارمان بھرا دل لیے بیٹھے تھے کہ بیٹے بہو سے گھر آباد ہو۔ چہل پہل ہو۔ خاندان کے طاقوں میں نئے چراغ روشن ہوں۔ ان کی اجاڑ زندگی نسل کو آگے بڑھتے دیکھ کر لہلہا اٹھے۔ دونوں طرف کی مجبوریاں ایک جیسی تھیں۔ کوئی صورت

نظر نہ آئی تو سلمہ بیگم نے دل کو مار لیا۔ پھر بھی یہ خیال دل سے نہ نکلا کہ ایک بار منصور اور صدیقی صاحب سے گھر داماد والی بات پوچھ تو دیکھیں۔

ایک دن انہوں نے احتیاطاً زہرہ سے بھی پوچھا "کیا واقعی یہ رشتہ تمہیں بھی پسند ہے؟" در اصل وہ چاہتی تھیں کہ ذرا سی بھی گنجائش پائیں تو کوئی ایسا داماد ڈھونڈیں جو ان کے ساتھ رہنا قبول کرے۔

زہرہ چپ رہی۔ کچھ جھینپ بھی گئی آنکھوں میں خفیف سا سرور آگیا

"اچھی طرح سوچ لو۔ یہ شادی ہے۔ کوئی گڑیوں کا کھیل نہیں ہے"

زہرہ نے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا "آگے حال اللہ جانے۔ جو کچھ سامنے ہے وہی میں دیکھ سکتی ہوں وہ آپ بھی دیکھ سکتی ہیں"

سلمہ بیگم سمجھ گئیں کہ لڑکی دل دیئے اور طے کئے بیٹھی ہے۔

اس کے بعد رشتہ پکا ہو گیا۔ گھر داماد والی بات نامنظور ہو گئی۔ رشتہ طے ہونے کے ایک ہی ماہ بعد شادی ہو گئی۔ سسرال ایک میل کی دوری پر تھی ماں بیٹی کا آنا جانا مہمانوں کی طرح ہونے لگا۔ ہر چند کہ زہرہ کا دل ماں کے لئے احساسات سے بھرا ہوا تھا۔ پھر بھی شادی چیز ہی ایسی ہوتی ہے کہ نئے ماحول اور نئے حالات کا ساتھ دینا ہی پڑتا ہے۔ وہ نئی زندگی میں بہت جلد رچ بس گئی ایک بار ماں پر اسے ترس آیا تو درخواست کی "کیوں امی کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ بھی ہمارے گھر اٹھ آئیں اور ہم سب ایک جگہ ہو جائیں"؟

پلک جھپکنے سے پہلے ہی سلمہ بیگم نے کہا "نہیں" اور اس ایک

نہیں میں سلمہ بیگم کا پورا کردار مضمر تھا۔ زہرہ اس کو اچھی طرح سمجھتی تھی اس نے کچھ نہیں کہا اب سلمہ بیگم زندگی کے تیسرے دور میں جینے کا ایک نیا تجربہ کر رہی تھیں وہ اکیلی رہ گئی تھیں۔ ایک حسنیٰ بوا تھیں کبھی بھولے بھٹکے اسکول کی کوئی استانی یا کسی شاگرد کی ماں آجایا کرتی۔ پڑوسیوں سے انھوں نے زندگی میں کبھی کوئی راہ و رسم نہیں رکھی تھی ایک تو وہ خود ہی کم آمیز تھیں دوسرے پڑوسیوں سے ان کا طبعی میلان نہ تھا، پڑوسی بھی بھانت بھانت کے تھے۔ کوئی کٹر ہندو تو کوئی کٹر مسلمان کوئی ان پڑھ تو کوئی ادھ کچرا پڑھا لکھا کوئی غریب نیم مہذب۔ یہ محلہ زیادہ تر تنخواہ پانے والے کلرکوں، چپراسیوں یا نیچے درجے کے ٹھیکیداروں سے آباد تھا۔ دو چار چھوٹے سرکاری افسروں کے خاندان بھی آباد تھے۔ مگر وہ سب ایک دوسرے سے بیزار نظر آتے تھے جا بجا مزدور بھی بسے ہوئے تھے۔ جن کے بچے کثیف اور جن کی عورتیں جھگڑالو اور بد زبان تھیں اور جو محض اپنی جہالت کی وجہ سے فحش حرکتیں اور فحش باتیں کیا کرتی تھیں۔ جن کی رہائش اتنی گھٹیا تھی کہ کھلے عام نل پر نہانا بھی انھیں معیوب نہیں تھا۔ ان کے گھر گھونسلے معلوم ہوتے تھے۔ ان بے چاروں پر سلمہ بیگم کو ترس تو آتا تھا۔ وہ ان میں گھل مل نہ سکتی تھیں یہی وجہ تھی کہ سلمہ بیگم برسوں سے اس محلہ میں رہنے کے بعد بھی اجنبی سی تھیں محلے کے نچلے طبقہ میں اسکول والی میم صاحب کے نام سے مشہور تھیں۔ بعض عورتیں انھیں بڑی

حسرت اور رشک سے دیکھا کرتی تھیں۔ کچھ کچھ یہ بات بھی مشہور تھی کہ وہ عشق میں پڑ کر گھر خاندان تیاگ کر اس محلے میں آن پڑی تھیں ورنہ ان کے باپ کی شہر میں بڑی بڑی کوٹھیاں تھیں۔

کبھی بیٹی آجاتی تو کبھی داماد۔ اور کبھی دونوں۔ ایسا کم ہونے لگا کہ خود سلمہ بیگم بھی بیٹی داماد کے گھر چلی جایا کریں۔ کسی کسی دن صدیقی صاحب بھی آپڑتے۔ سمدھی اور سمدھن کی جوڑ برابر کی تھی لوہے کو لوہا کاٹنے کی کوشش کیا کرتا۔ دونوں منجھی ہوئی تہذیب کے پروردہ تھے۔ بڑی دلچسپ فقرے بازیاں اور چشمکیں ہوا کرتیں۔ ان کی کسی کسی بات پر سلمہ بیگم کا جی باغ باغ ہو جاتا۔

صدیقی صاحب میں برجستگی اور بذلہ سنجی تھی۔ سلمہ بیگم بڑی فراخ دلی سے ان کی خاطر تواضع کرتیں۔ پہنچ گئے تو کیا مجال کہ کھانا کھائے بغیر چلے جائیں۔ اگر کھانے کے وقت نہ ہوتا تو کھانے کے وقت تک رک جانا پڑتا۔

ایک دن باتوں باتوں میں صدیقی صاحب نے کہا "کیا معلوم تھا کہ زندگی میں کبھی اتنی بڑی استانی بھی مل جائیں گی ورنہ جاہل ہی رہ گیا ہوتا اور آپ سے پڑھنا شروع کرتا۔"

"بسم اللہ" سلمہ بیگم بولیں "میں آج بھی اپنے اسکول میں آپ کا داخلہ لینے کے لئے تیار ہوں۔ میں نے بڈھے طوطوں کو بھی پڑھنا سکھایا ہے۔"

"ابتدا تو چھوٹے طوطوں سے ہی کی ہوگی ۔ شہر میں ماشاء اللہ آپ کے پڑھائے ہوئے طوطوں کا طوطی بولتا ہے ۔ ایک میرے ہی طوطے کو ایسا پڑھایا کہ آپ کی طوطی کا قفس بند ہو کے رہ گیا ۔"

جی نہیں آپ کا طوطا پڑھا پڑھایا تھا ۔ پٹھا پہلے دن مجھے ہی پڑھانے آیا تھا ۔ مگر برخوردار کو چھٹی کا دودھ یاد آگیا ۔ لاکھ پڑھا کے بھیجا ہو آپ نے پھر بھی کچھ پڑھ کر ہی گیا ۔"

"جی ہاں بیٹا تو پڑھ کر پاس ہوگیا ۔ اب بچارے باپ کی باری آئی ہے ۔"

"بیٹا ذہین تھا نکل گیا ۔ مگر باپ کی قسمت میں فیل ہونا ہی لکھا ہے ۔"

غرض اپنے اوپر سنجیدگی طاری رکھنے والی سلمہ بیگم کو صدیقی صاحب کی زندہ دلی نے اس حد تک بے تکلف کر لیا تھا کہ وہ خوش طبعی کی باتوں سے لطف لینے لگیں تھیں وہ صدیقی صاحب کے بھرپور چیت فقروں کو بھی گوارا کر لیتیں ۔ اکثر و بیشتر انھیں صدیقی صاحب کا انتظار رہنے لگا جب کبھی کئی روز گزر جاتے اور صدیقی صاحب نہ آتے تو وہ اسکول سے فون کر کے یاد دلایا کرتیں ۔

"آپ کو راستہ بھولے ہوئے کافی دن ہوگئے ۔"

صدیقی صاحب کے گھر کا ماحول کچھ ایسا تھا کہ محتاط ہو کر بات چیت کرنی پڑتی تھی اس لئے چٹخارے والی باتیں سلمہ بیگم ہی کے گھر پر ہوا کرتی تھیں ۔ سلمہ بیگم نے سالہا سال تک اپنے وجود کو تقریباً

فراموش کیے رکھا تھا اپنے لیے یا اپنے بارے میں کچھ بھی نہ سوچا۔ مگر اب وہ سوچنے لگی تھیں۔ انھیں محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ زندہ تھیں ان کا اپنا بھی ایک وجود تھا۔ جس میں دھڑکن اور تپش باقی تھی۔ آتشدان ابھی سرد نہیں ہوا تھا۔ زندگی کے سالہا سال کے فراموش کیے ہوئے تقاضے سلمہ بیگم سے انصاف چاہنے لگے۔

ایک شام پھر چائے پر صدیقی صاحب سے خوش گپیاں چل رہی تھیں۔ صدیقی صاحب نے بڑی دلسوزی سے ایک شکوہ کیا۔ "میں تو بھئی اکیلا کا اکیلا ہی رہ گیا۔ زہرہ اور منصور تو سیر سپاٹے میں کچھ ایسے غائب رہتے ہیں کہ گھر سے کھانے اور سونے کے سوا کچھ ناطہ ہی نہیں۔ شام کو دفتر سے آتا ہوں تو دونوں باہر نکلنے کی تیاری کر رہے ہوتے ہیں۔ رات کو لوٹتے ہیں تو میں بستر پر جا چکا ہوتا ہوں اور صبح کو دونوں اس وقت اٹھتے ہیں۔ جب میں دفتر جانے کی تیاری کر رہا ہوتا ہوں اتوار کو بھی دونوں کا باہر ہی کا کوئی نہ کوئی پروگرام لگا رہتا ہے۔ پکھیرو پنچھی ہیں۔ ان سے کہہ بھی کیا سکتا ہوں۔"

"آپ ضرور بور کرتے ہوں گے تبھی دونوں دور رہنے ہی میں عافیت سمجھتے ہوں گے مگر وہ نماز اور تلاوت کا کیا ہوا جس کی کڑی شرط آپ نے لگائی تھی؟"

"آپ کے پڑھائے ہوئے طوطے ناول پڑھیں گے۔ فلمیں دیکھیں گے۔ رقص وحشت راک ان رول، کریں گے وہ بھلا نماز

اور قرآن پڑھیں گے۔"

سلمہ بیگم کسمسا کر بولیں۔ "صدیقی صاحب! میرا خیال ہے کہ آپ شادی کر گزریئے۔ پھر آپ ان بچوں کے پیچھے پڑنے کی زحمت سے بچ جائیں گے۔ آپ دونوں میاں بیوی گھر میں چھوٹی سی مسجد بنا کر اللہ اللہ کیا کیجیے گا۔"

صدیقی صاحب نے گرہ لگائی: "دوسروں کو مشورہ دینے سے پہلے میں اچھی طرح غور کر لیا کرتا ہوں کہ خود مجھے اس مشورہ کی کہاں تک ضرورت ہے۔"

سلمہ بیگم کے رخساروں کی سرخی ذرا گہری ہو گئی۔ انھوں نے بھینچی آنکھوں سے صدیقی صاحب کو دیکھا۔ جن کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ شاید یہ سوچ کر کہ انھوں نے سلمہ بیگم کے دل میں گدگدی پیدا کر دی تھی۔ تقریباً ایک منٹ کی خاموشی کے بعد وہ نظر نیچی کر کے بولیں۔ "ہمیں کچھ اور محتاط ہونا چاہیئے۔ بات کہیں سے کہیں بہک جاتی ہے۔"

"بیگم ہاشمی! میرا مشورہ ہے کہ آپ اپنا نام ہی محتاط بیگم رکھ لیجیے۔"

صدیقی صاحب تمسخر سے بولے۔ "ایک تو آپ نے بیٹی کو محتاط بنا کر بھیجا ہے۔ جو میرے لفظوں کا جواب دو تین لفظوں میں دیا کرتی ہے اور کبھی محض ہاں یا نہیں پر اکتفا کرتی ہے۔ یہاں آتا ہوں۔ تو آپ الگ احتیاط کا شکنجہ لئے بیٹھی ہیں یہ کوئی عدالت یا پارلیمنٹ ہے۔"

سلمہ بیگم مسکرائیں، خادمہ کو آواز دے کر ہدایت کی: "صدیقی صاحب

کا خیال رکھنا کھائے بغیر ٹلیں گے نہیں۔"

صدیقی صاحب نے ہنستے ہنستے ہی کہا "آپ کے گھر کا کھانا منہ کو لگتا جا رہا ہے۔"

"لکھنؤ کے نیموں نچوڑ والی باتیں کرتے ہیں آپ۔"

دونوں ہنس پڑے۔

اس رات سلمہ بیگم نے اپنے بارے میں یکسو ہو کر سوچا۔ صدیقی صاحب کی وہ بات رہ رہ کے بازگشت کرتی رہی:۔ دوسرے کو مشورہ دینے پہلے میں اچھی طرح غور کر لیا کرتا ہوں کہ خود مجھے اس مشورہ کی کہاں تک ضرورت ہے شادی ——— ؟ دل نے کہا "نہیں نہیں۔۔ کیا دھرا ہے شادی میں۔ اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ابھی کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ ان کی نظر رینگتے دیوار کے اس گوشے میں گئی جہاں کبھی پروفیسر ہاشمی مرحوم کی تصویر لگی رہتی تھی، مگر اب وہ جگہ خالی تھی، شادی کے بعد زہرہ اس تصویر کو تبرک یا جہیز سمجھ کر اٹھا لے گئی تھی۔

سلمہ بیگم اپنے اوپر بڑھاپے کا احساس مسلط کر لینا چاہتی تھیں مگر یہ قبل از وقت کیسے ممکن تھا۔ ناک نقشے کا تیکھا پن گیا نہیں تھا۔ صحت و توانائی برقرار تھی جسم ویسے ہی گٹھیلا اور کسا ہوا تھا بھنویں آج بھی تھرکتی تھیں۔ موٹی موٹی آنکھوں میں دلوں کو زیروزبر کرنے والی صلاحیت برقرار تھی۔ بالوں کی سیاہی بھی ماند نہیں پڑی تھی ڈھلتی جوانی کی عمر ادھیڑپن سے پہلے کچھ ایسی گئی گذری تو نہیں ہوتی کہ کوئی

بجھ کے رہ جائے۔ پھر سلمیٰ بیگم کی تازگی تو اپنی ہم عمروں سے زیادہ ہی تھی جیسے صبح کا کھلا ہوا گلاب جسے شام کی ان ناسازگاریوں سے واسطہ ہی کہاں پڑا تھا۔ جو زندگی اور صحت کی دشمن ہوتی ہیں۔ زندگی سکھ اور بے فکری میں گذری تھی۔ حفظانِ صحت کی سخت پابند تھیں۔ چلن پاکیزہ اور رہائش ستھری رہی۔ ازدواجی زندگی صرف تین سال اور ایک بچی پر ختم ہو گئی۔ عمر بھر میں ایک غم اٹھایا سو وہ بھی کچھ ہی دنوں میں مٹا مٹا سا ہو کر رہ گیا۔ شوہر کی موت کے بعد جذبات اور احساسات کا دھارا، زہرہ کی طرف مڑ گیا۔ تو بیوگی کا سوگ بھی دیرپا ثابت نہ ہو سکا، خود فراموشی نے غلط کر دیا۔ پھر صحت اور تازگی کے زور میں انحطاط کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا۔ مگر وہ خواہ مخواہ اپنے کو سن سے اتری ہوئی فرض کر کے اچانک لپک اُٹھنے والے شعلے پر پانی چھڑکنا چاہتی تھیں فرض کرنے سے حقیقت تو نہیں بدل جاتی۔ رابعہ بصری یا میرا بائی بننے کے لئے محض سادہ پوشی اور سادہ روی تو کافی نہیں۔

آج بھی سلمیٰ بیگم کے رنگ روپ کی ذرا سی مشاطگی کتنی ہی مہ لقاؤں کی نظر نیچی کر سکتی تھی۔ اب بھی انھیں دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ ان کا خمیر دودھ اور شہد سے اُٹھایا گیا ہے۔ کندن کی طرح دمکتے ہوئے چہرے سے خون چھلکا پڑتا تھا۔ شاید سلمیٰ بیگم نے اپنے کو صدیقی صاحب کی نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ بیوگی کے بعد زندگی کے جلتے ہوئے اوجھل تقاضوں کے سرچشمہ پر انھوں نے کچی مٹی تھوپ

کر دھارا روک دیا۔ مگر سوتا پھر پھوٹ پڑا۔ جس کا پریشان کن احساس ابھی انھیں ہو چلا تھا۔ یہی وہ احساس تھا جس سے صدیقی صاحب کے ایک ریمارک پر ان کے رخساروں کی سرخی شوخ ہو گئی تھی اور جس نے سہمے ہوئے چوکنا لہجے میں ان سے کہلوایا تھا۔

"ہمیں کچھ اور محتاط ہونا چاہیئے۔"

صدیقی صاحب کی دلچسپی محض ملاقات اور خوش گپیوں پر قانع نہ تھی نوبت زلف و رخسار تک پہنچی تھی۔ جس کا قابل گرفت احساس انھیں ابھی ہوا تھا اور نہ سلمہ بیگم کو اس کا شک گذرا تھا۔ صدیقی صاحب کی زندگی تشنہ اور ادھوری تھی۔ اس لئے وہ سلمہ بیگم کی ملاقاتوں میں خلش اور نا آسودگی کا مداوا پاتے تھے۔ ایک طرح کی زندگی اور ایک طرح کے حالات نے دونوں میں ذہنی قربت پیدا کر دی تھی۔ ان کے درمیان وہ ساری باتیں موجود تھیں جو دو ہستیوں میں ذہنی اور جذباتی قربت پیدا کر دیتی ہے۔ بیٹے کی شادی کے بعد صدیقی صاحب کو اپنے بارے میں سوچنے کی فرصت مل گئی تھی۔ بلکہ اس کی ضرورت محسوس کرنے لگے تھے۔ جیسے زندگی کا ایک مشن پورا کرنے کے بعد وہ خالی خالی اور تنہا تنہا محسوس کرنے لگے ہوں۔ شریانوں میں خون کی گردش تیز پڑ گئی۔ مگر یہ سب کچھ ابھی مبہم مبہم اور دھندلا دھندلا تھا۔ وہ پنپتا ہوا چور احساس ابھی دل میں گوریّا کی مانند پھدکتا پھر رہا تھا۔

اسی بے خبری میں سلمہ بیگم کی لئے دیئے رہنے والی طبیعت کی

گرہ یہاں تک کھلی کہ کسی کسی بات پر وہ کھلکھلا کر ہنس دیا کرتیں۔ یہ کھنکتی ہوئی ہنسی بڑی لبھانے والی تھی۔ دانت بڑے چمکیلے اور نگینے کی طرح جڑے ہوئے تھے۔ ہلکے گلابی ہونٹوں کے درمیان دانتوں کی سجی ہوئی لڑیاں جن کی ہر جھلک سے جیسے صدیقی صاحب کی آنکھوں کی روشنی بڑھ جاتی تھی۔ سلمیٰ بیگم سے باتیں کرتے ہوئے انھیں طالب علمی کے زمانہ کے رومانی اور عاشقانہ اشعار یاد آنے لگے۔ کبھی کبھی سلمیٰ بیگم کوئی شوخ اور چبھتا ہوا فقرہ چست کر کے فاتحانہ مسکراہٹ سے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتیں۔ اس وقت صدیقی صاحب کے دل کا چور اودھم مچانا شروع کر دیتا اور اس پر قابو پانے کے لئے وہ اپنی نماز وغیرہ کا دھیان کرنے لگتے۔ وہ پکے نمازی تھے۔ مگر آنکھیں شرابی تھیں۔ بوجھل بوجھل ڈھلکی ڈھلکی۔ سلمیٰ بیگم کی موٹی موٹی کمند انداز آنکھوں کو یہ آنکھیں پسند تھیں۔ وہ ان کے بھرے پرے ملیح چہرے پر ان کی آنکھوں کو اس طرح دیکھا کرتیں جیسے یا تو خود سمانا چاہتی ہوں یا پھر ان آنکھوں کو اپنی آنکھوں میں سمانا چاہتی ہوں۔

ایک بار ازراہ تفنن سلمیٰ بیگم نے ایک ریمارک بھی کر دیا۔

"اگر آپ نمازی نہ ہوتے تو آنکھوں سے دنیا آپ کو شرابی سمجھتی۔"

"مگر ان آنکھوں کے بارے میں بھی فرمائیے۔ جن میں شراب خانے آباد ہیں۔"

سلمیٰ بیگم کو چپ دیکھ کر صدیقی صاحب نے اپنی بات میں اضافہ کیا۔

"اگر میری حکومت ہوتی اور حسینوں کی قسمت سے میں شاعر بھی

ہوا ہوتا تو ایسی آنکھوں کو قابل تعزیر قرار دیتا ـــــ روئے سخن کسی کی طرف ہو تو رو سیاہ"!

"بس بس رہنے دیجئے۔ اگر میری حکومت ہوتی تو آپ میرے دربار کے ملّا دو پیازہ ہوتے، ویسے بھی آپ اس تاریخی ہستی سے شجرہ نسب ملا لیں تو کسی کو شک نہیں گزرے گا۔

اس جوابی ریمارک سے سلمہ بیگم کو کچھ تسکین ہوئی اور کچھ جھینپ مٹی۔

یہ وہ دن تھے جب سلمہ بیگم کی سادہ پوشی میں ہلکی ہلکی شوخی جگہ پانے لگی تھی۔ آرائش اور زیب و زینت کی جھلکیاں نظر آنے لگی تھیں۔ نئی تہذیب کی جوان اور روشن خیال بیوہ کی آرائش جہاں تک انگلیاں اٹھنے کے قابل نہیں ہوتی، سلمہ بیگم اس حد کو چھو چکی تھیں۔ کچھ ایسا بننا سنورنا تو نہ تھا پھر بھی یہ آشکارا تھا کہ بننے سنورنے کی آرزو دل کو گدگدانے لگی تھی۔ جس کمرے میں صدیقی صاحب کی ہم نشینی رہتی تھی۔ اس کی سجاوٹ بھی بڑھ گئی تھی۔ کبھی کبھی میز پر تازہ کھلے ہوئے پھول بھی بکھرے ہوتے۔ ابھی شاخ سے اتر کر زلفوں تک پہنچنے کی ساعت نہیں آئی تھی۔

گفتگو کی چاشنی بڑھتی ہی گئی۔ موضوع کی کوئی قید نہیں تھی۔ جب جو بات نکل جائے۔ ایک بار ایسا بھی ہوا کہ محبت اور شادی جیسے نازک مسئلے پر بات چل پڑی اور پھر ازدواجی زندگی کے فلسفہ پر بحث شروع ہو گئی۔ صدیقی صاحب ازدواجی رشتے کو تہذیب کی بنیاد اور ازدواجی زندگی کو معاشرت کی آبرو قرار دے رہے تھے۔ مگر سلمہ بیگم کچھ زیادہ اس کے حق

میں نہیں تھیں۔ وہ تاریک پہلوؤں پر زیادہ سے زیادہ زور دے رہی تھیں —— "محبت شادی اور ازدواج یہ سب گوشت پوست کے وحشی پن کے مہذب نام ہیں۔۔ جنسی وحشت پر پردہ ڈالنے والے خول ہیں۔ یہ سب جسم کی باتیں ہیں۔ روح اور جسم دونوں ایک ساتھ زندہ نہیں رہ سکتے ایک کی زندگی دوسرے کی موت۔"

اس کے بعد سائیکلوجی اور پھر براہ راست سیکس تک بات پہنچی۔

اس بے مقصد اور بے نتیجہ بحث کے اختتام پر سلمیٰ بیگم نے چٹکی لی۔

"جب آپ اس حد تک قائل ہیں تو آپ کو شادی کر ہی لینی چاہیئے۔"

"بسم اللہ۔ آپ آج نماز شروع کر دیجیئے، میں کل شادی کر لوں گا۔"

"کیا آپ کی شادی کے لیئے دعا مانگنے کو نماز شروع کروں؟"

"آخر شادی اور نماز میں کیا واسطہ؟"

"مجھے کسی نمازی خاتون ہی سے شادی کرنا راس آسکے گا۔"

"گویا آپ شادی عورت سے نہیں نماز سے کرنا چاہتے ہیں۔ اب تو نماز پڑھتے بھی ڈر ہی لگے گا کہ کہیں آپ مجھ ہی سے شادی کر بیٹھیں۔"

دونوں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ بات تو صدیقی صاحب نے صاف ہی کہہ دی تھی۔ مگر سلمیٰ بیگم کے تجاہل عارفانہ نے بات کو توڑ مروڑ دیا۔

صدیقی صاحب نے پینترا بدلا۔ "دیکھیئے آپ نے ایک بار پہلے بھی شادی کر لینے کا مشورہ دیا تھا۔ آخر آپ کو میرے سراسر نجی معاملات کی اتنی فکر کیوں ہے؟ آپ کیوں دُبلی ہو رہی ہیں؟"

"مجھے آپ سے ہمدردی ہے اور میں محسوس کرتی ہوں کہ آپ کو واقعی شادی کی ضرورت ہے۔

"واہ یہ بھی خوب رہی۔ ضرورت میری اور محسوس کریں آپ۔ بڑی روشن ضمیر ہیں آپ!"

"ہاں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔"

نفسیات پر آپ کا مطالعہ تشنہ معلوم ہوتا ہے۔ بعض اوقات انسان کو کوئی حاجت یا خواہش ہوتی ہے۔ مگر کسی نہ کسی وجہ سے وہ اس کو محسوس کرنے کی جرائت اپنے اندر نہیں پاتا۔ صحیح اور غلط یا جائز و ناجائز کے تذبذب میں پڑا رہتا ہے اور غیر شعوری طور پر منتظر رہتا ہے کہ کوئی اس کو خود اپنی ضرورت کی طرف متوجہ کرے تاکہ اس کی جرائت کو جواز مل جائے۔ سو آپ کے لئے یہ خدمت میں نے انجام دیدی ہے۔"

صدیقی صاحب کچھ ایسے خاموش ہوئے، جیسے بات پتے کی ہو۔ مگر کچھ رکھنے کے لئے تو انھیں کچھ نہ کچھ کہنا ہی تھا۔ بولے "کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لوگ اپنی ذاتی نفسیات کے چوکھٹے میں دوسروں کو فٹ کرنے کا تجربہ کیا کرتے ہیں۔"

"مگر دیکھ لیجئے صدیقی صاحب! آپ کے دل میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب میں جام جم میں دیکھ رہی ہوں۔ آپ شادی ضرور کرنا چاہتے ہیں اور ضرور کریں گے۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو میں اپنا نام بدل دوں گی۔"

"میں آپ کے لئے ایک حسین سا نام سوچوں گا تاکہ نام بدلنے میں

آپ کو قباحت نہ ہو۔"

سلمیٰ بیگم کی خادمہ حسنی بوا بڑی پرانی تھی۔ پروفیسر ہاشمی کی زندگی ہی سے ان کی خدمت میں رہتی آئی تھی۔ اس نے زمانہ دیکھا تھا۔ کتنے ہی قصے اور تماشے اس کی نظروں سے گزرے تھے۔ وہ جانتی تھی۔ کہ برسات کی پھواروں سے تو بنجر زمین پر بھی ہریالی اُگ آتی ہے اور سلمیٰ بیگم کو بنجر زمین بھی کون کہہ سکتا تھا۔ بدن پلا بنا تھا۔ جوانی دن ڈھلے کی پہلی ساعت کے سورج کی طرح تھی۔ ذرا دیر کا ڈھلا ہوا سورج کچھ بجھا ہوا نہیں ہوتا۔ اس کی دھوپ اور تمازت تو قابل انکار نہیں ہوتی۔ ہاں کبھی چڑھتے ہوئے سورج کو ہلکی بدلیوں نے ڈھک لیا تھا۔ مگر اب بدلیاں چھٹ چکی تھیں۔ اس کو یقین تھا کہ صدیقی صاحب سے بیگم سلمہ کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کا سبب معمولی نہیں ہو سکتا، سلمیٰ بیگم جو کبھی ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتی تھیں۔ ان کا ایک نووارد سے اس طرح گھل مل جانا رمز سے خالی نہیں ہو سکتا۔

ایک روز سلمیٰ بیگم کا منہ میلا دیکھ کر وہ پوچھ بیٹھی ـــ "بیگم صاحب! جی تو اچھا ہے آپ کا؟"

"ہاں بیگم صاحب۔ چھوٹی بی بی کے جانے سے تو گھر اور بھی سونا ہو گیا۔ اب اکیلے کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ وہ تو بھلا اسکول ہے کہ دن کٹ جاتا ہے یا پھر کتابیں ہیں۔ کتابیں ہی تو پڑھتے دیکھتی ہوں۔ نہ کہیں آنا نہ کہیں جانا۔ نہ سیر نہ تفریح۔ ذرا دیر کو صدیقی صاحب آجاتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ آدم زاد کا بسیرا ہے۔ ورنہ وہی کتابیں۔ یہ کوئی جینا ہے۔ بیگم صاحبہ!"

"مگر بوا کتابیں بھی کہاں تک ساتھ دیں۔ ہر وقت تو کتابیں بھی اچھی نہیں لگتیں۔"

"میں تو کہتی ہوں بیگم صاحبہ! اب بات پرانی ہو گئی۔ میکے والوں میں جا ملیں۔"

"میکے ہی میں کیا دھرا ہے۔ ماں باپ رہے نہیں۔ بہن بھائی سب جہاں تہاں ہو گئے۔ سب ہوتے بھی تو دل نہ مانتا تم جانتی ہو بوا کہ مجھ پر کیا گزری۔ کیا ستم ٹوٹا مجھ پر۔ شادی ہی تو کر رہی تھی ایسے شخص سے جو مجھے پسند تھا اور ہر طرح میرے لائق تھا۔ جس کے ساتھ میری بات بھی پرانی اور مشہور ہو چکی تھی۔ تم ہی کہو بوا آخر اس شادی میں کیا عیب تھا۔ مجبوری اور مصلحت دونوں تھیں میرا دامن بے داغ تھا۔ مگر اپنوں کو بھی اعتبار نہ آیا۔ میرے لئے کوئی چارہ نہ تھا۔ مرتے دم تک ایسے لوگوں کے لئے میرے دل میں عزت اور محبت پیدا نہ ہو سکی۔ اسی شہر میں ماں باپ مرے، میں نے ان کا مرا منہ بھی نہ دیکھا۔ دل پتھر ہو گیا ہے میرا۔ میں نے جائداد میں حصہ لینے سے بھی انکار کر دیا۔"

سلمیٰ بیگم کی آواز میں رقت پیدا ہو گئی اور آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

مگر بیگم صاحبہ آپ کی عمر ہی کیا ہے۔ پہاڑ جیسی زندگی ہے کاٹنے کو۔ کچھ سوچیے۔ مجھے تو ہر وقت آپ ہی کا خیال لگا رہتا ہے۔ زہرہ بی بی پرائی ہو گئیں۔ میں بھی کتنی دور تک آپ کا ساتھ دینے کو بیٹھی رہوں گی۔ بڑھاپا ٹھہرا، کب ساتھ چھوٹ جائے۔ میں تو میکے ہی جانے کو کہوں گی

کوئی اور بات کیسے کہوں۔ چھوٹا منہ اور بڑی بات ہوگی۔ صدیقی صاحب خاندانی آدمی ہیں۔ کوئی کمی نہیں۔ نہ جانے کیا لکھا بدا ہے کہ اب تک انھیں دوسری شادی کا خیال نہ آسکا ہے۔"

حسنی بوا نے دراصل ان کے دل کو ٹٹولنے کی کوشش کی مگر سلمہ بیگم نے کچھ نہ کہا۔ بے چارگی سے ایک نظر اس کو دیکھ کر کسی خیال میں کھو گئیں۔ خادمہ چلی گئی۔"

وہ رات سلمہ پر بہت بھاری گزری۔

ماضی، حال اور مستقبل تینوں خلط ملط ہو کر دل و دماغ میں کھلبلی مچا رہے تھے۔ حسنی بوا اور صدیقی صاحب نے ان کے اندر ہلچل ڈال دی تھی۔ ایک سال کے اندر خیالات اور احساسات میں جتنے اتار چڑھاؤ ہوئے تھے۔ ان سب کا تجزیہ کرتی رہیں اور آخر میں ایک سوال نے دل و دماغ میں انتشار پیدا کر دیا —— "کیا مجھے شادی کی ضرورت ہے —— ؟ کیا مجھے شادی کرنی پڑے گی —— ؟ کیا مجھے شادی کر لینی چاہیے —— ؟" وہ اندر ہی اندر جھنجھلا اٹھیں۔

وہ کروٹ پر کروٹ بدلتی رہیں۔ رات کے پچھلے پہر نیند آنے سے پہلے انھوں نے اپنے سرکش شعور کو جھڑک دیا —— "نہیں ہرگز نہیں۔ ضرورت ہو تو بھی غیرت گوارا نہیں کر سکتی۔"

شعور نے حجت کی —— "بعض ضرورتیں غیرت سے زیادہ طاقتور ہوتی ہیں۔ جب ضرورت سچی اور غیرت جھوٹی ہو تو سپر ڈالنی پڑتی ہے۔

اور تم تو بہت فرینک اینڈ پریکٹیکل ہو۔"

"نہیں، میں جسم کی غلامی قبول نہیں کر سکتی۔ اس کے اکیلے پن میں سکون ہے، نجات اور آزادی ہے۔ جسم کی غلامی زندگی کے لئے آزار ہے۔ آج میرا صرف ایک مسئلہ ہے۔ لیکن جسم کے شکنجے میں آنے کے بعد کتنے ہی مسئلے پیدا ہو جائیں گے۔ یہ مسائل متعدی ہوتے ہیں۔ ایک سے دوسرا جنم لیتا ہے۔ چین سے مرنا بھی نصیب نہیں ہوتا۔

سلمہ بیگم نے شعور کو چپ تو کر دیا اور انھیں نیند بھی آگئی۔ مگر شعور کے ہونٹوں پر اعتماد کی مسکراہٹ مچلی۔ وہ انھیں نیندیں بھی ستاتی رہی پھر بھی انھوں نے شعور کو اپنے طابع کئے رکھا۔

شادی والے معنی خیز مذاق کے بعد صدیقی صاحب ایک ہفتہ تک سلمہ بیگم کے گھر نہ آسکے۔ زہرہ آئی، منصور بھی آیا۔ پوچھا تو معلوم ہوا صدیقی صاحب بھلے چنگے تھے۔ دفتر میں ٹیلیفون کیا تو انھوں نے مسخرے پن سے جواب دیا —— "دراصل میں آپ کے لئے ایک قابل قبول نام کی تلاش میں ہوں۔ مل جائے تو آؤں۔ کبھی آپ کے شایان شان کوئی تحفہ پیش نہ کر سکا۔ سوچتا ہوں ایک حسین سا نام ہی سہی۔"

"آئیے نہ آئیے۔ مگر ایک بات آپ کے کان میں ڈال دوں۔ آج ہمارے یہاں مچھلی کے کباب تلے جا رہے ہیں۔ اتفاق سے اسکول کی لڑکیاں کچھ سوغاتیں بھی دے گئی ہیں۔

"دلی کا حلوا سوہن"

"منظفر پور کی لیچیاں"

"تبھی میں حیران ہوں کہ ریسیور سے خوشبوئیں کیوں بھبک رہی ہیں۔ آپ نے ان ساری نعمتوں کو جوٹھا ضرور کیا ہے۔ جس کی چغلی ٹیلیفون سے آتی ہوئی خوشبو کھا رہی ہے۔"

"مجھے یقین ہے کہ اچھے آدمی اچھی ہی باتیں کیا کرتے ہیں۔"

"اچھی بُری کا فیصلہ آپ پر۔ شاید غیر محتاط ہو۔ مجھے آپ پر تو نہیں اپنے پر شک گزرنے لگا ہے کہ بات دسترخوان سے دامن تک نہ پہنچے۔"

سلمیٰ بیگم دھک سے رہ گئیں۔ زبان اس طرح دانت تلے آ گئی، جیسے "ہائے مری" کی چیخ زیرِ لب نکلتے نکلتے رک گئی ہو۔ انھوں نے ٹیلیفون رکھ دینا چاہا۔ مگر ایک لمحہ کے لئے سوچا اور بات ختم کرنے کے لئے عاجلانہ لہجے میں کہا ــــ "معلوم ہوتا ہے ان دنوں آپ آئینہ دیکھ کر شیو نہیں کر رہے ہیں۔ تبھی دسترخوان اور دامن میں کوئی فاصلہ نظر نہیں آتا۔"

انھوں نے کچھ اور سننے کا انتظار نہ کیا بلکہ جھٹ سے ریسیور رکھ دیا۔

اس خیال انگیز گفتگو کے بعد انھوں نے اسکول کے کام میں طبیعت کو حاضر نہ پایا۔ دو گھنٹے پہلے ہی نکل بھاگیں۔ گھر آتے ہوئے راستے بھر وہ اپنے آپ سے باتیں کرتی رہیں۔ صدیقی صاحب کو بھی کیا اس عمر میں عشق بازی کا شوق چرایا ہے۔ کچھ غلط سلط اڑ گئی تو جگ ہنسائی ہو جائے گی۔ زہرہ اور منصور کے دل پر کیا گزرے گی! مگر یہ کچھ ریجھ ہی گئے۔ ورغلا کے گمراہ کرنا چاہتے ہیں۔ بوڑھی گھوڑی لال لگام کی پھبتی سنوارنا چاہتے ہیں۔ اتنے سال تو اپنے کو مار کر

رکھا۔ اب کیا منہ کا مزا بدلنے کی ہوس کریں۔ مگر ان صدیقی صاحب سے پیچھا کیسے چھوٹے؟ انھیں کون کہے کہ پتھر میں جونک نہ لگائیں۔ کیا جانا تھا کہ ایسے گلے پڑ جائیں گے۔ خیر ان کا دھیان تو کسی طرح موڑنا ہی ہے۔

مگر شادی کی ضرورت تو انھیں ہے ہی۔ مرد کچھ ہوتے ہی ایسے ہیں۔ مگر کیا غلط نظر انتخاب پڑی ہے ان کی۔ کچھ کھل کر ہی کہنے لگے۔ رسوا کریں گے مجھے۔ میں بھی کچھ کم بخت نہیں۔ جان بوجھ کے لفٹ دیتی رہی۔ کچھ بھی ہو آدمی سجیلے اور لبھا لینے والے ہیں۔ کالج کے چھوکروں جیسی کٹیلی اور رسیلی باتیں کرتے ہیں۔ تجاوز کرتی ہوئی عمر کو بھی فراموش کیے رکھتے ہیں۔ اکتالیس بیالیس سے کیا کم ہوں گے۔ قصور کچھ اپنا بھی ہے ان کے انتظار میں بعض بے چین شامیں گزری ہیں۔ گھر بلا بلا کے ان کی وہ باتیں سنی ہیں جن کی شہ پر دستر خوان سے دامن تک پہنچنے کی جرأت کا اظہار کر بیٹھے ہیں۔ آج آئیں تو صاف صاف کہہ دوں گی۔ ہاں کیوں نہ شائستہ کی شادی ان سے کرا دوں۔ دونوں ضرورت مند ہیں۔ ان کی شادی ہو جانی چاہیے۔

بھوکے شیر کا اعتبار نہیں۔ خود نہ کہہ سکی تو بوا سے کہلواؤں گی ___ مگر کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ سب میری بدگمانی ہی ہو اور حقیقت کچھ بھی نہ ہو؟"

مگر 'حقیقت کچھ بھی نہ ہو' کے گمان پر سلمہ بیگم کے اندر احساس کی ایک بے چین لہر تڑپ اٹھی۔ صدیقی صاحب کی شادی کا تصور کر کے نہ جانے کیوں انھیں تسکین سی محسوس ہوئی تھی جیسے اپنی شادی کے تصور سے

کسی کنواری کے دل میں غنچہ چٹک جائے۔ کہیں یہ لذت معکوس کا تجربہ نہ رہا ہو۔

گھر پہنچیں تو زہرہ وہاں پہلے ہی سے آئی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں کچھ شرمائی شرمائی سی تھیں۔ حسنی بوا نے دیکھتے ہی کہا ـــــ "بیگم صاحبہ مبارک ہو!" پھر اشارے سے الگ بلا کر کان میں کچھ کہنے لگی تو زہرہ نے دور ہی سے ٹوکارا دیا۔

"نہیں امی بوا بکتی ہے۔" مگر سلمیٰ بیگم کی آنکھوں میں جوت سی جگمگا اٹھی تھی۔ وہ زہرہ کی طرف پلٹیں تو اس نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ سلمیٰ بیگم کے ہونٹوں پر تبسم کی لہریں پھیلتی اور سمٹتی رہیں۔

زہرہ کی شادی کو ایک سال گزر چکا تھا اور اب سلمیٰ بیگم کے نانی اماں بننے کے آثار تھے۔ صدیقی صاحب کے آنے سے پہلے ہی زہرہ وہاں سے چلدی۔ آج سلمیٰ بیگم کو محسوس ہوا۔ جیسے اچانک چہرے پر جھری پڑ گئی ہو۔ اور وہ بے خیالی میں چہرے کی جلد کو سہلانے لگیں۔ جو ویسے ہی چکنی اور بے شکن تھی۔

صدیقی صاحب بھی غضب کے آدمی تھے۔ ان سے باتیں کرتے ہوئے سلمیٰ بیگم کو نہ صرف اپنی عمر دس سال کم محسوس ہوتی بلکہ یہ خیال بھی ذہن سے محو ہو جاتا کہ ان کی کبھی شادی ہوئی تھی اور اب وہ ایک بیاہتا لڑکی کی ماں تھیں۔ صدیقی صاحب کبھی ایسی کوئی بات گفتگو میں آنے نہیں دیتے تھے جو عمر وغیرہ کا احساس دلائے۔ انھوں نے سلمیٰ بیگم کی ہمدردی حاصل کر لی تھی۔ ان کی زندگی کے اسی ادھورے پن کو بہلانے کے لئے وہ

سلمہ بیگم کے ساتھ گھنٹوں خوش وقتی اور فرار کی باتوں میں گزار دیا کرتے تھے۔ بڑی ہلکی پھلکی باتیں ہوا کرتی تھیں، جیسی کہ فریب و فرار کی باتیں ہوا کرتی ہیں۔ دونوں ہی ایک مخصوص ڈھنگ سے اور مخصوص قسم کی باتیں کرنے کے خوگر ہو چکے تھے۔ ان چوٹوں کے علاوہ چھپی چھپی حسرتیں بھی ہوتیں۔ ان کی اکثر باتوں کی بازگشت جو ان کے دل سے آتی تھی وہ ایک ٹھنڈی اور طویل ”کاوش“ سے زیادہ کچھ نہ تھی۔

آج بھی صدیقی صاحب اپنی ادائے خاص سے وارد ہوئے تو سلمہ بیگم نے گفتگو کا آغاز یوں کیا ——— ”میں نہ جانتی تھی کہ آپ کی نظر اتنی چھچھوری ہے۔ بھوکی بلی کی طرح۔“

”بلی سے دودھ کی رکھوالی کی توقع رکھنا شاید دنیا کی سب سے بڑی حماقت ہے۔“

”مگر دسترخوان کو دامن تک پہنچنے کا وسیلہ بنانا اعتماد شکنی ہے اور پرلے درجے کے نمک حرامی ہے۔“

سوال یہ ہے کہ اِدھر نمک کھایا اُدھر کافور ہوا۔ آپ کی باتوں کی مٹھاس نمک کو زائل کر دیتی ہے اگر بات غیر محتاط نہ ہو تو عرض کروں کہ آپ کا نام بھی لینے سے منہ میٹھا ہو جاتا ہے۔ پھر نمک کا سوال ہی کہاں باقی رہتا ہے۔ مگر یہ سارا نمک جاتا کہاں ہے؟ شاید آئینہ آپ کو اس کا جواب دے سکے۔

سلمہ بیگم آج پھر عرق عرق ہو گئیں۔ مگر صدیقی صاحب کی ساحری ان کے

بدک اٹھنے والے مزاج کو رام کر چکی تھی۔

گفتگو کا رُخ بدلنے میں ہی انھوں نے عافیت سمجھی ——— "صدیقی صاحب آج واقعی میں سیریس ہوں۔ آپ کے طور بے طور نظر آنے لگے ہیں۔ آپ شادی کر ہی لیجیے۔"

"میری نظر میں ہے ایک۔"

"ممکن ہے جو آپ کی نظر میں ہو وہی میرے دل میں بھی ہو۔" انھوں نے بات کو مذاق میں اڑا دینا چاہا۔

"سچ مذاق نہیں۔ میری ایک اسسٹنٹ ہے۔ صورت شکل قابل قبول ہے۔ صحت اچھی۔ عمر یہی کچھ چھبیس ستائیس ہوگی، پانچ چھ سال سے بیوہ ہے۔ ایک بچہ ہوا تھا مر گیا۔ گریجویٹ ہے۔ خاندان اچھا ہے۔ آپ ہی کی طرح اس کی زندگی ادھوری ہے۔ بڑی مہذب اور شائستہ ہے۔ اتفاق سے ان کا نام بھی شائستہ خاتون ہے۔"

"اگر محتاط بیگم نام ہوتا اور بھی چار چاند لگ جاتے۔"

سلمیٰ بیگم کو سنجیدگی کے باوجود ہنسی آگئی۔ مگر پھر فوراً سیریس ہو گئیں۔

"میں پوری ذمہ داری سے کہتی ہوں کہ آپ راضی ہوں تو بیل منڈھے چڑھ سکتی ہے۔ بالکل اپنے بس کی بات ہے۔"

"اچھا کیا آپ نے جو بتا دیا۔ معلوم نہیں تھا کہ آپ کے ہاں یہ سب بھی چلتا ہے۔ خیر شادی کرانا بھی ایک نیکی ہے۔ دیکھوں گا کوئی امیدوار ملا تو آپ سے رجوع کرا دوں گا۔"

"بات ٹالیے نہیں" سلمیٰ بیگم نے ان کو گرفت میں لینے کی کوشش کی۔ —— "مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ آپ کی یہ ویرانی اور تنہائی ختم ہو جائے۔ آپ اپنی ضرورت کو بلکہ اس حق کو محسوس کرتے ہوئے خواہ مخواہ جھجکتے ہیں۔ مگر میں اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔ میری التجا ہے کہ آپ میری بات مان لیجیے۔ اپنے آپ پر اتنا ظلم بھی جائز نہیں۔"

سلمیٰ بیگم نے یہ باتیں کچھ ایسی غیر معمولی اہمیت کے ساتھ کہیں کہ صدیقی صاحب کو سوچنا پڑ گیا۔ کچھ تو شادی کے مسئلہ پر اور کچھ سلمیٰ بیگم کی اس پراسرار ترغیب کی اصلیت کے بارے میں ان کی پیشانی پر ایک ابھرتی ہوئی شکن دیکھ کر سلمیٰ بیگم نے سمجھا کہ لوہا گرم ہو چکا ہے۔ اس لئے انھوں نے پھر زور ڈالا —— "دیکھتے جائیے آپ بھی وہی ہیں جو میں کہہ رہی ہوں۔ مجھے یا اپنے آپ کو دھوکے میں رکھنے کی کوشش نہ کیجیے۔ میں ایک دم سمجھ گئی ہوں، ٹھیک سمجھی ہوں۔"

آخر صدیقی صاحب نے دل کی پہلی گرہ کھولی —— "واہ صاحب! اچھی مسیحائی ہے۔ آپ دل کی بیماری کا علاج کونین کھلا کر کرنا چاہتی ہیں۔ معاملہ دل کا ہو تو اور بات ہے شادی کا ہرگز نہیں۔ جس طرح آپ کو میری فکر ہے اسی طرح میں بھی چاہتا ہوں آپ بھی اپنے بارے میں کچھ سوچیں۔"

اس بے ساختہ اور غیر مبہم اظہار شیفتگی پر ایک لمحہ کے لئے سلمیٰ بیگم کے خون کی روانی تھم گئی اور انھیں مان لینا پڑا کہ چند گھنٹے پہلے جس بات پر انھیں غلط فہمی کا گمان گزرا تھا وہ حقیقت تھی۔ وہ چپ ہیں۔ کچھ کہتے

بن نہیں پڑ رہی تھی۔ دل میں چور تھا۔

"آپ نے کوئی جواب نہیں دیا؟"

سلمہ بیگم کسی خیال سے چونکیں ——— "جی ہاں۔ جواب کیا دوں؟"

"عجیب بے تکی بات ہے۔ یا تو آپ سوچ کر بولے نہیں یا مجھے ہی سمجھنے میں کچھ چوک ہوئی ہے۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔"

"آپ کے دونوں خیال غلط ہیں۔ میں نے ٹھیک کہا اور آپ نے بھی ٹھیک ہی سمجھا۔"

"مگر یہ ناممکن ہے صدیقی صاحب۔ میں ماضی کو دہرانے پر اپنے آپ کو تیار نہیں کر سکتی۔ میں بہت آگے نکل چکی ہوں۔"

"یہ خود فریبی ہے۔ ورنہ ہم دونوں کا مسئلہ ایک ہی ہے۔ میں یقین اور اعتماد سے کہتا ہوں۔"

مہینوں کی تمہید کے بعد آخر آج گفتگو براہ راست مقصد اور اصل نکتے پر پہنچ گئی۔ سلمہ بیگم کو شیشے میں اتارنے کا آج آخری موقع تھا۔

صدیقی صاحب محسوس کر رہے تھے کہ اگر آج بات نہ بنی تو پھر کبھی نہ بن سکے گی۔ انھوں نے سلمہ بیگم کا بڑا گہرا مطالعہ اور تجزیہ کیا تھا۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ غیر شعوری طور پر کس طرح سلمہ بیگم نے زندگی کو نیا موڑ دینے کے لئے دھیرے دھیرے اپنے کو تیار کیا تھا۔ کس طرح زندگی کے نئے تقاضوں کو لبیک کہنے کے آثار ان کے اندر پیدا ہوئے تھے۔ سلمہ بیگم نے کچھ ابتدا ہی سے اپنے آپ کو اس رنگ میں پیش کیا تھا کہ ان کی آرزو کی

جا سکے۔ نظر کو لبھانے والی چیز ہی دل کو لبھاتی ہے۔ نظر سے پیار اور دل سے بیر کیسے ممکن ہے۔ اس معاملے میں دونوں ہی ایک دوسرے کے متعلق حساس تھے۔“

سلمیٰ بیگم پھر پسینہ پسینہ ہو چکی تھیں۔ وہ سوچنے لگیں کہ ایک بار وہ شادی سے پہلے بدنام ہوئی تھی مگر تب کی بات اور تھی۔ نوجوانی کی عمر ہی کچھ بدنام ہونے کی ہوتی ہے اب وہ دوبارہ ـــــ وہ بھی شادی کے بعد ـــــ بدنامی کا داغ لگانے کی ہمت ان کے اندر نہیں تھی۔ اب حالات کچھ اور تھے وہ دودھ کے جلے کی طرح ڈری اور سہمی ہوئی تھی۔ خون میں اتنا جوش نہیں تھا کہ مخالف ہوا کی زد پر سینہ تانے کھڑی رہ سکیں۔ وہ ان کی فرینک اینڈ پریکٹیکل والی شخصیت بھی مضمحل ہونے لگی تھی۔ سب سے بڑا اور سب سے ٹیڑھا سوال سمدھیانے کے رشتہ کا تھا۔ جو باہمی شادی کے لئے سماج میں ناجائز کی حد تک معیوب تصور کیا جاتا ہے۔ آخر سماج میں کوئی تماشہ بن کے کیسے جی سکتا ہے۔“

انھوں نے فیصلہ سنا دیا ـــ ”کچھ بھی ہو صدیقی صاحب میں شادی کرنا نہیں چاہتی۔ مجھے اس کی ضرورت ہی نہیں۔“

”آپ کی تینوں باتیں جھوٹ ہیں۔“

”معاف کیجئے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ میرے بارے میں سوچنا چھوڑ دیں۔ میں اپنے انتہائی ذاتی معاملات میں کسی کی دلچسپی پسند نہیں کرتی۔“ سلمیٰ بیگم نے برا مان جانے کے تیوروں میں کہا۔

صدیقی صاحب کے چہرے پر آج انہوں نے پہلی بار خفت کے آثار دیکھے۔

گفتگو رک گئی ۔ چند منٹوں کی تکلیف دہ خاموشی کے بعد جب انہوں نے رخصت چاہی تو سلمہ بیگم نے معذرت اور تاسف کا اظہار کرنے کے لئے کہا ۔

"آج کچھ باتیں ایسی ہوئی ہیں جو نہ ہوتیں تو اچھا تھا ۔ آپ تلخی کو یہاں تھوک جایئے ۔"

صدیقی صاحب نے جواباً کچھ نہیں کہا ۔

سلمہ بیگم کی زبان سے جو باتیں نکلی تھیں ان سے خود ان کا دل خوش نہیں تھا ۔ دل اور زبان میں جنگ ہونے لگی ۔ صدیقی صاحب کو مایوس کر کے وہ اپنے اندر بے چینی محسوس کر رہی تھیں ۔ دونوں چپ بیٹھے ایک دوسرے سے آنکھیں چرانے کی کوشش کر رہے تھے ۔

کھانے سے پہلے ہی فراغت ہو چکی تھی اور حسنی بوا اپنے سارے کام نپٹا کر دوسرے کمرے میں لیٹ چکی تھیں ۔ سلمہ بیگم کے کمرے کی بتی بجھنے کے انتظار میں ابھی اس کمرے کی بتی جل رہی تھی ۔ حسنی بوا کو بیگم صاحبہ کے سو جانے کے بعد ہی اطمینان ہوتا تھا ۔ اب وہ خادمہ نہیں رہ گئی تھی ۔ بلکہ اس کی حیثیت یک نفری فیملی میں بزرگ عورت کی تھی ۔

"اچھا اب اجازت ہو ۔"

کہہ کر صدیقی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے ۔

ٹھیک اسی لمحے ہوا کا ایک سرد اور تند جھونکا سرسراتا ہوا

کمرے میں آیا۔ سلمہ بیگم نے باہر دیکھا تو گھنگھور گھٹائیں اُمنڈ پڑی تھیں پھر دوسرا جھونکا آیا پہلے سے زیادہ تیز اور تند یہ جھونکا کھڑکیوں اور کواڑوں کو جھنجھوڑ گیا۔ میز پر پڑا اخبار پھڑ پھڑا کر منتشر ہو گیا۔ معاً تیسرے جھونکے کے ساتھ بادل گرجا اور بجلی کڑکی۔ انھوں نے ایک نظر باہر اور ایک نظر صدیقی صاحب کو دیکھا۔ اس وقت ان کے چہرے پر جو گہری مایوسی اور مسکین معصومیت تھی اس نے سلمہ بیگم کے دل کو تڑپا دیا۔

نہایت نرم اور صلح کن لہجے میں بولیں "باہر جھکّڑ چل رہے ہیں۔ بادل ٹوٹے پڑ رہے ہیں طوفانی بارش کا ڈر ہے ذرا سماں بدل جائے تو چلے جایئے گا۔"

"ابھی ابھی تو سماں بدلا ہے۔ پھر دوسرے سماں کا انتظار کون کرے؟ یہ گھن گرج زمین والوں کو آسمان کی وارننگ ہے۔"

"شاعری نہ کیجیے۔ تشریف رکھئے خدانخواستہ آپ کو کچھ ہو! تو الزام مجھ پر آئے گا۔"

باہر بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ موٹی موٹی بوندیں ٹپ ٹپ پڑ رہی تھیں۔ ہوا کا وحشی پن لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہا تھا۔ پانی کے چھینٹے کھڑکیوں سے کمرے میں آنے لگے اسی بڑے کمرے میں کھڑکی کے پاس سلمہ بیگم کا بستر بھی تھا۔ صدیقی صاحب حیص بیص میں اب تک کھڑے ہی تھے ہر لحظہ بارش کی تیزی بڑھ رہی تھی۔ ذرا سی دیر میں

کمرے کے اندر نمی اور خنکی محسوس ہونے لگی۔ ہواؤں کا زور شور بڑھتا ہی گیا۔

"بس اب بیٹھ بھی جائیے" سلمہ بیگم اس طرح بولیں جیسے کوئی ماں بچے کی ضد پر زچ ہو کر ہنکارے اور ساتھ ہی کھڑکی بند کرنے کو بڑھیں۔ اس بار صدیقی صاحب طوعاً و کرہاً بیٹھ گئے۔ باہر صحن اور سائبان کی طرف حسنی بوا ہڑبڑ کھڑبڑ کر رہی تھی۔ بارش سے بچانے کی چیزوں کو اِدھر اُدھر کر رہی تھی۔"

حسنی بوا نے آدھے سے زیادہ کھلے ہوئے کواڑوں سے سلمہ بیگم کے کمرے کا جائزہ لیا ـــــ صدیقی صاحب موجود تھے۔ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ حسنی بوا مسکرائی۔ اگر سلمہ بیگم اس مسکراہٹ کو دیکھ پاتیں تو زمین میں گڑ جاتیں یہ ایک ذرا سا تبسم سارے قصے کا حاصل تھا۔ حسنی بوا بہر حال زمانہ دیکھے ہوئی عورت تھی۔ زندگی کا ایک تہائی حصّہ اس نے بیگم سلمہ کی خدمت میں گزارا تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ دریا لبالب چڑھا ہوا تھا۔ ذرا سی ہلچل سے پانی اپٹ سکتا تھا۔ اس نے سلمہ بیگم کو پاؤں کے ناخن سے لے کر سر کے بال تک کتاب کی طرح پڑھا تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ ان کا آنچل فرشتوں کی نماز کے لئے تنگ ہو چکا ہے۔ اس لئے سلمہ بیگم کی وہ بات بھی یاد آ رہی تھی ـــــ "کتابیں بھی کہاں تک ساتھ دیں ہر وقت کتابیں بھی تو اچھی نہیں لگتیں ـــــ" ان کو ایسے مونس کی

ضرورت تھی جو حساس اور ناطق ہو کیونکہ اب ان کی زندگی ایک بار پھر جذبات اور احساسات کے دور میں داخل ہو چکی تھی۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ کچھ دنوں پہلے سلمہ بیگم نے اپنی خوراک کی فہرست سے گوشت انڈا مچھلی کو قلمزد کر دیا تھا۔ مگر یہ سلسلہ ایک ہفتہ سے زیادہ نہ چل سکا۔ بیگم صاحبہ شیر کو گھاس کھلانے چلی تھیں مرغ و ماہی کا پلا ہوا جسم ٹھنڈی غذا کا ایک نوالہ بھی قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ نہ جانے ایک ہفتہ ہی انھوں نے کیسے کاٹا ہو گا۔ جنتی بوا سلمہ بیگم سے بھی زیادہ عملی طور پر سوچنے والی عورت تھی۔ صدیقی صاحب کی طرف ان کے جھکاؤ کو وہ اسی روشنی میں دیکھتی تھی۔

اب موسلادھار بارش ہو رہی تھی۔ ہر طرف پانی کی گڑگڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ بارش اور بادلوں کی گھن گرج سے باہر کی فضا بھیانک ہو رہی تھی۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ صدیقی صاحب اخبار پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور سلمہ بیگم کسی رسالے کو جابجا سے الٹ رہی تھیں۔ شاید ان کے پاس اب گفتگو کا کوئی موضوع نہیں رہ گیا تھا۔ وہ ایک موضوع جو عنوان بدل بدل کر کب سے چلتا آیا تھا آج اس پر بھی سلمہ بیگم خاتمے کی مہر لگا چکی تھیں۔ زبان خاموش سہی مگر دلوں میں شور برپا تھا۔ بارش کے تھمنے کے آثار نہیں تھے ایسے میں کوئی سواری باہر مل جانے کی امید کم ہی ہو سکتی تھی اور سلمہ بیگم کے گھر تک تو کوئی بلائی ہوئی سواری ہی پہنچ سکتی تھی ان

کی گلی شاہراہ سے کچھ دوری پر تھی۔ کئی ٹیڑھی میڑھی تنگ گلیوں سے گذرنے کے بعد سلمہ بیگم کا مکان ملتا تھا۔

صدیقی صاحب نے اکتاہٹ کی گہری سانس لے کر پہلو بدلا۔

سلمہ بیگم نے بڑی سی آرام کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ وہاں آرام سے بیٹھئے نہ جانے ابھی کتنی دیر اور رکنا پڑے کہئے تو دوسرے کمرے میں سونے کا انتظام کر دوں؟"

"شکریہ مجھے نیند نہیں آئے گی۔ لوگ ہوم سک ہوتے ہیں لیکن میں بیڈ سک ہوں" یہ کہہ کر وہ آرام کرسی پر نیم دراز ہو گئے۔

"کچھ باتیں کیجئے ایسے گپ چپ بیٹھے بوریت ہو رہی ہے"۔

"آپ ہی کچھ کہئے میں تو خالی ہو چکا ہوں۔ صرف سننے کا موڈ ہے"۔

"معاف کیجئے"۔ سلمہ بیگم کی قاتل مسکان پھر دھندلے ستارے کی طرح جھلملائی۔

"آپ نے میرے لئے کوئی نیا نام سوچا ہے۔ اب تو شاید اس کی ضرورت پڑ ہی جائے"۔

"جی ہاں سوچا تھا۔ مگر معلوم ہوا کہ وہ نام آپ کو پسند نہیں"۔ صدیقی صاحب اس طرح بولے جیسے کسی بت کے ہونٹ ہلنے لگے ہوں۔

"آپ نے تو نام بتایا نہیں۔ پھر کیسے سمجھ لیا کہ مجھے پسند نہیں"۔

"کچھ باتیں یوں بھی سمجھ میں آتی ہیں"۔

"پھر بھی سنایئے تو سہی۔ اس کا فیصلہ میں خود کروں گی۔"

"آپ نے تو فیصلہ کر دیا۔"

"پہیلیاں نہ بجھوایئے۔ صاف صاف کہیئے۔"

"میں نے سوچا تھا کہ کتاب کا ورق الٹ دوں جس پر آپ کی زندگی کا پہلا باب ختم ہوتا ہے اور آگے کے تمام اوراق نکال کر نئے سرے سے نیا باب لکھنا شروع کر دوں۔"

"لاحول ولاقوۃ —— کبھی غلطی سے سیدھی بات بھی کر لیا کیجئے۔ میں نے صرف نام پوچھا ہے۔ اگر آپ نے واقعی سوچا ہے۔ بس ذرا دلچسپی کے لئے۔"

"وہی تو عرض کر رہا ہوں۔"

"کیا بھلا؟"

"سلمہ صدیقی"

سلمہ بیگم کے حلق میں جیسے اچانک بلغم آ گیا اور سُنی اَن سُنی کرنے کے لئے کچھ اس انداز سے چونکیں جیسے معاً کچھ یاد آ گیا ہو۔ دروازے کی طرف رخ کر کے ذرا بلند آواز میں پکارا۔

"بوا سو رہی ہو کیا؟"

بازگشت کی طرح دوسرے کمرے سے آواز آئی۔

"آئی بیگم صاحبہ۔"

پھر بھی سلمہ بیگم کرسی سے اُٹھ کر چوکھٹ کے پاس جا کھڑی ہوئیں۔

اور حسنی بوا کے آنے کا انتظار کئے بغیر وہیں سے اونچی آواز میں کہا۔

"صدیقی صاحب تو آج پھنس گئے گھر نہیں جا سکے۔ رات ٹھنڈی ہے، کافی مل جائے پینے کو تو مزا آجاتا۔"

"مگر دودھ نہیں ہے بیگم صاحبہ۔"

"دودھ نہیں ہے تو چائے پلاؤ۔ مگر رنگ ذرا ہلکا ہو۔"

اس کے بعد سلمہ بیگم کو ریڈیو کا خیال آیا۔ انہیں اپنی کھلبلی کو چھپانے کے لئے فرار اور گریز کا کوئی نہ کوئی بہانہ چاہیے تھا۔ ریڈیو لگا تو دلی سے مشاعرہ ہو رہا تھا۔ کوئی شاعر بڑی سریلی آواز میں غزل گا رہا تھا۔ ترنم کی لہریں کمرے کی محبوس فضا میں تیرنے لگیں۔ سلمہ بیگم اپنی جگہ پر جا بیٹھیں۔ غزل ختم ہوئی تو انہوں نے داد دی۔ "بڑی اچھی غزل تھی۔"

"شعروں اور غزلوں سے میرا اعتبار اٹھتا جا رہا ہے۔ ان میں نہ کوئی اثر ہے نہ سچائی۔ خواب اور خیال کی باتیں ہیں۔ تجربہ یہی بتاتا ہے۔" صدیقی صاحب نے مردہ دلی سے کہا۔

دوسری غزل شروع ہو چکی تھی۔

"باتوں کی تہہ داری اور گرہ داری بتاتی ہے کہ آپ کو دائمی قبض کی شکایت ہے۔ خدا جانے نوجوانی میں آپ کا کیا عالم رہا ہوگا۔"

سلمہ بیگم پھر مسکرائیں۔ یہ مسکراہٹ بڑی فتنہ تھی۔ صدیقی صاحب

کو چڑ سی لگی۔ یہ ایک مسکراہٹ ہزار بے ایمان اداؤں کا کام کر جاتی تھی۔ کسی مشاق اور ماہر طوائف کی مسکراہٹ بھی اتنی کارگر نہیں ہو سکتی۔ تاریخ کی بدنام ترین عورتوں کی مسکراہٹ بھی ایسی ہلاہل نہیں رہی ہو گی۔ صدیقی صاحب کو ریشمی کپڑے کی چمک جیسی جھلمل کرتی اس مسکراہٹ میں کھلی ہوئی جنسی ترغیب محسوس ہوا کرتی تھی۔

وہ بدستور بت کی طرح خاموش اور ساکت آرام کرسی پر پڑے تھے۔ وہ عورت کی حقیقت پر غور کر رہے تھے۔ جو پیاز کی مانند تہہ بہ تہہ شروع سے آخر تک چھلکا ہی ہوتی ہے۔ عورت جس کی زبان میں شہد اور دل میں زہر ہوتا ہے۔ جو مرد کو اپنی باتوں اور اداؤں کے طلسم میں پھنسا کر نہ جانے کون سی لذت حاصل کرتی ہے، جو مرد کو تماشہ بنا دیتی ہے۔ دنیا کا ہر مرد سب سے بیوقوف اور بے بس عورت کے معاملہ میں بنتا ہے۔ جو کبھی اپنے بال و پر پھیلا کر کائنات پر محیط ہو جانا چاہتی ہے اور کبھی خود ہی سمٹ کر ایک نقطہ بن جاتی ہے۔ جو شکست کھا کر بھی اپنے فاتحانہ غرور کی نمائش کرتی ہے۔ جو مرد کے بس میں ہو تو جھاگ بن جاتی ہے اور جب مرد اس کے بس میں ہو تو پارہ بن جاتی ہے — جو یہ ہے — جو وہ ہے۔

صدیقی صاحب کی ان ساری بدگمانیوں کا رخ اس وقت سلمیٰ بیگم

کی طرف تھا۔

ریڈیو پر مشاعرہ جاری تھا۔ مگر کیا پڑھا جا رہا تھا۔ دونوں میں سے کسی کا دھیان اس طرف نہ تھا۔ دریں اثنا حسنیٰ بوا چائے لے آئی۔ سلمہ بیگم نے چائے کی ٹرے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ "اچھا بوا اب تم جاؤ آرام کرو، میں خود بنا لوں گی"۔ جاتے جاتے پھر وہی کچھ دیر پہلے والی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

چائے کا پیالہ صدیقی صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے انھوں نے کہا ——

"کبھی شاعری تو کی ہوگی آپ نے؟ کچھ نہیں تو دو چار مصرعے ہی موزوں کئے ہوں گے؟"

صدیقی صاحب نے کچھ کہے بغیر چائے کی چسکی لی۔

اپنا کوئی شعر —— لنگڑا لولا ہی سہی —— یاد ہو تو سنایئے۔ ترنم سے پڑھتے رہے ہوں گے آپ؟"

سلمہ بیگم کی شوخی اور چھیڑ خانی نے بجلی کے اس تار کو پھر زندہ کر دیا جو کچھ دیر پہلے فیوز کر گیا تھا۔ بولے۔

"شاعری کی تو نہیں مگر اس کا کفارہ ضرور ادا کر رہا ہوں سوچتا ہوں کفارہ ادا کرنا ہی ٹھہرا تو شاعری بھی کیوں نہ شروع کر دوں"۔

"خیر سے برسات کا موسم بھی ہے۔ بسم اللہ شروع ہو جایئے"۔

سلمہ بیگم نے یہ بات ذرا ہنستے ہنستے ہی کہی اور کچھ سوچ کر یکایک

ایسی ہنسی آئی کہ چائے گریبان اور دامن پر چھلک گئی۔ صدیقی صاحب نے موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ کہا۔ دیکھیے ایک مصرع موزوں ہو گیا ہے قبول فرمائیے ؎

دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ“

”چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے۔ آپ دامن و گریبان کی آرزو سے باز نہ آئیں گے۔ چلیے حسرت ہی سہی۔“ کہا تو سہی مگر ان کی کیفیت ایسی ہو گئی جیسے کسی نک چڑھی لڑکی پر بر سرِ عام کوئی شائستہ فقرہ چست کر دیا گیا ہو۔

اور پھر ذرا ہی دیر بعد صدیقی صاحب نے دیکھا —— غور سے دیکھا اور دیر تک دیکھا —— کہ سلمیٰ بیگم کی نم نم سی موٹی موٹی آنکھیں سلگ اٹھی تھیں۔ آنکھوں کا رنگ ایسا جیسے کچے گلابی میں رنگی ہوئی ململ پہلی بار دھل کر آئی ہو۔ انگاروں پر سے راکھ کی جھلّی جیسی تہہ جھڑ جانے سے آتش دان دہک اٹھا تھا۔ پلکیں کبھی اٹھتی تھیں کبھی جھکتی تھیں۔ صدیقی صاحب کی وہ گستاخ شرابی آنکھیں شیر کی مانند نڈر نظر آ رہی تھیں۔ رواں رواں سہر اٹھنے سے سلمیٰ بیگم کے سارے مسامات کھل گئے تھے دل کے اندر جیسے کوئی ناٹک چل رہا تھا۔ تبھی تو دفعتاً ان کی زبان سے نکل پڑا —— ”نہیں نہیں —— ہرگز نہیں“ اور اس کے ساتھ ہی تنفس کا ہیجان برپا ہو گیا۔ دراصل زندگی کے کمزور ترین لمحے کی شہ زوری پر وہ جھنجھلا اٹھی تھیں۔

صدیقی صاحب نے محسوس کیا کہ اگر انھوں نے کچھ دیر اور سلمہ بیگم کو دیکھا تو وہ غش کھا جائیں گی۔ اس لیے انھوں نے ریڈیو کی طرف منہ کر لیا۔ مشاعرہ چل رہا تھا۔ مگر موسم کی خرابی سے رہ رہ کر جو رخنہ پڑ رہا تھا اس نے پروگرام کو بے مزہ کر دیا تھا۔ بارش کا زور ذرا کم ہو چکا تھا۔ مگر جھکڑ ویسے ہی چل رہے تھے۔ صدیقی صاحب شیر کو سدھانے کا ناقابل اعتبار تجربہ کر کے اب غنودگی محسوس کرنے لگے تھے۔

صبح سورج نکلنے سے پہلے حسنی بوا کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ رات بھر برسنے کے بعد آسمان صاف شفاف ہو گیا تھا۔ ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ صحن کے گملوں میں لگے ہوئے پھولوں میں تازگی اور شادابی تھی۔ بیلا اور جوہی کے تازہ کھلے ہوئے پھولوں سے آنکھوں کو فرحت محسوس ہو رہی تھی۔ ان کی بھینی بھینی خوشبو ہوا کی کسی لہر کے ساتھ پھیل کر جنت کی گواہی دے رہی تھی۔ گلی میں اخروٹ کے ہرے بھرے درخت پر ابھی چڑیوں کی چہکار شروع نہیں ہوئی تھی۔ کوئی اکیلی مینا مدھم سروں میں حمد و ثنا کر رہی تھی۔

اس کی نظر سلمہ بیگم کے کمرے کی طرف اٹھی۔ کواڑ کے دونوں پٹ بدستور نصف سے زیادہ کھلے ہوئے تھے۔ بتی جل رہی تھی۔ باہر سے نظر آنے والی میز اور دونوں کرسیاں خالی تھیں۔ ماحول پر غنودگی اور خاموشی طاری تھی۔ وہ دبے پاؤں کمرے کی چوکھٹ تک گئی کھڑکیاں بند تھیں۔ زینے کی طرف کھلنے والا دروازہ بھی بند تھا۔ سلمہ بیگم کا سفید براق

چادر والا بستر خالی تھا۔ تہہ کی ہوئی اونی چادر پلنگ کی پائینتی میں ویسے ہی اچھوتی پڑی تھی۔ دونوں تکیے بھی قریب اور سلیقے سے جوں کے توں رکھے تھے، نہ بھینچے ہوئے نہ دھنسے ہوئے، بستر پر کوئی سلوٹ نہ تھی۔ جیسے چادر پھیلانے کے بعد استری کر دی گئی ہو۔ صدیقی صاحب آرام کرسی پر نیم دراز ہلکے ہلکے خراٹے لے رہے تھے۔ سر ایک طرف کو ذرا سا ڈھلکا ہوا تھا۔ مگر سلمہ بیگم کہاں تھیں۔ خادمہ کا جی ڈر گیا۔ وہ فوراً دوسرے کمرے کی طرف لپکی جس میں زہرہ رہا کرتی تھی۔ مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ پھر وہ دھڑکتے دل اور تیز قدموں کے ساتھ غسل خانے کی طرف گئی۔ ادھر بھی خالی ہی پایا تشویش اور گھبراہٹ میں وہ پھر سلمہ بیگم کے کمرے کی طرف پلٹی جس میں دروازے کی طرف پشت کئے آرام کرسی پر صدیقی صاحب سو رہے تھے۔ اس بار وہ اندر داخل ہو گئی۔ تین چار قدم اندر جاتے ہی وہ ٹھٹک گئی۔ دیدے حیرت سے اور ہونٹ تبسم سے پھیل گئے۔ دل نے تسکین اور آنکھوں نے ٹھنڈک محسوس کی۔ وہ چپ چاپ پلٹ گئی۔

سلمہ بیگم کا آدھا دھڑ فرش پر پھیلا ہوا اور آدھا دھڑ صدیقی صاحب کی ٹانگوں پر ٹکا ہوا تھا اس طرح کہ صدیقی صاحب کے زانوؤں پر ایک بازو اور بازو پر سر دھرے انہیں نہ جانے رات کی کس گھڑی میں نیند آ گئی تھی۔ آنچل ڈھلکا ہوا۔ لمبے بالوں کی ایک موٹی لٹ زمین پر لوٹتی ہوئی۔ آنکھیں ذرا کھلی کھلی سی۔ ہونٹ غنچے کی مانند چٹکے ہوئے۔

نازک بات

بے چارہ رمضانی ابھی چالیس کی عمر کو بھی پہنچنے نہیں پایا تھا کہ لڑکی اچانک جوان ہو گئی۔ اچانک اس لئے کہ لڑکی ہمیشہ سے نظر کے سامنے رہی۔ اور اس نے محسوس ہی نہیں کیا کہ وہ کب کتنی بڑی ہو گئی۔ اس کو تو خواب و خیال تک نہ تھا کہ لڑکی کبھی جوان بھی ہو گی۔ وہ ابھی تک اسے ننھی بچی ہی سمجھے بیٹھا تھا۔ اِسی لئے بات بات پر ننھے بچوں کی طرح اس کو ڈانٹتا پھٹکارتا رہتا، جمیلہ کے بعد دو بھائی تھے۔ اور سبے چھوٹی ایک بہن تھی۔ رمضانی ذرا تیز مزاج کا آدمی تھا۔ کسی بات پر زیادہ غصہ آجاتا تو بے دھڑک مار پیٹ بھی شروع کر دیتا۔ چاہے بیوی ہو یا بچے ہوں۔ اور بچوں میں جمیلہ بھی شامل تھی۔

جس دن کا ذکر ہے اس دن بھی کوئی بات رمضانی کے مزاج کے خلاف ہوئی تو اس نے دھڑ سے ایک تھپڑ جمیلہ کے گال پر جڑ دیا اور وہ بلبلا کر سسکنے لگی۔

رمضانی کو یہ فرق بھی محسوس نہ ہو سکا کہ پہلے تو جمیلہ منہ کھول کر رویا کرتی تھی

مگر اب کچھ دنوں سے وہ محض سسکیاں ہی بھرتی تھی، رمضانی کی بیوی مار کھا کھا کے بھی منہ چڑھی ہی رہی۔ آج رمضانی کی اس ناشائستہ حرکت پر وہ بپھر اٹھی۔ منہ کڑوا کر کے بولی "کیسے بے شرم ہو جی۔ جوان بیٹی پر ہاتھ اٹھاتے ہو۔ بیٹی کی آہ پڑی تو ہاتھ . . . . . کٹ کے گر جائیں گے۔"

رمضانی چونک پڑا —— "ہائیں، یہ کیا —— جوان بیٹی! کیا جمیلہ جوان ہو گئی؟ اتنی جلدی۔"

پھر اس نے ایک کونے میں دیوار سے لگی سسکتی ہوئی جمیلہ کو سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا —— کم بخت واقعی جوان ہو گئی تھی۔ قد کہاں سے کہاں نکل گیا تھا۔ کچھ موٹی تازی بھی لگتی تھی۔ دل نے کہا مگر یہ حرامی آناً فاناً اتنی بڑی کیسے ہو گئی! ابھی کل تک تو وہ پیسے چرا کر مٹھائی خرید لیا کرتی تھی۔ اور آج جوان ہو گئی —— جوان!

رمضانی میاں کے دماغ میں جو غصے کا انگارہ دہک رہا تھا اس پر جیسے کسی نے پانی کا گھڑا انڈیل دیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بیوی کا منہ تکنے لگا جیسے کہنا چاہتا ہو "یہ بچی کیوں جوان ہو گئی؟ اب کیا ہو گا —— اب کیا ہو گا؟ اب میں کیا کروں؟ رکشا چلانے اور اینٹیں ڈھونے والے کی بیٹی کو کیا حق ہے جوان ہونے کا! میں غفلت میں پڑا رہا۔ اور یہ سوٴر کی بچی چپکے چپکے جوان ہوتی رہی۔ مری بھی نہیں۔ شہر میں کتنی بار ہیضہ آیا، چیچک پھیلی مگر اس کٹھ جیو کا کبھی کچھ نہ بگڑا۔ گز بھر لٹھا اور گز بھر چھینٹ کی شلوار قمیص پہننے والی ایک دم سے —— ایک دم سے —— اب میں اتنا کپڑا . . . . کہاں سے لاؤں گا؟ اتنا کھانا کہاں

سے لاؤں گا ؟

اس سے چھوٹے چوپٹے ہیں وہ الگ سوّر کی طرح تھوتھنی رگڑتے پھرتے ہیں کہ کہاں کچھ مل جائے کہ پیٹ میں ڈال لیں۔ یہ سسری تو اپنے لیے چوری کا مال بن گئی کہ نہ دکھاتے بنے نہ چھپائے بنے۔

بیوی برتن دھونے سے فارغ ہو کر گیلی ساڑھی کے آنچل میں ہاتھ پونچھنے لگی۔ شوہر کو سکتے کے عالم میں دیکھ کر تیکھے لہجے میں بولی ”الو کی طرح میرا منھ ...... کیا تک رہے ہو۔ ٹھیک ہی تو کہتی ہوں۔ لڑکی چھوٹ کے جوان ہو چکی ہے کوئی لڑکا دیکھو۔ نشہ پانی کی عادت چھوڑو۔ یہ جو حرام سوّر میں پیسہ پھینک آتے ہو، وہ بند کرو۔“

آج پہلی بار بیوی کی بات رمضانی کو بری نہیں لگی، کبھی کبھی بیوی پر ہاتھ چھوڑ دینا رمضانی کی عادت تھی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بیوی کو نہیں چاہتا تھا۔ چاہت کا عالم تو یہ تھا کہ اگر وہ کبھی بیمار ہو جاتی تو رمضانی اس کے پاس بیٹھ کر رونے لگتا اور کچھ اس طرح کی باتیں کہا کرتا ”تم بیمار کیوں ہوتی ہو۔ تم مر جاؤ گی تو میرا کیا ہوگا؟ میں تو ہمیشہ یہی دعا کرتا ہوں کہ تم سے پہلے مروں۔“

ایسی باتیں سن کر بیوی اس کے منھ پر ہاتھ رکھ دیا کرتی اور ایک بار تو اس نے ایسی بات کہہ دی تھی کہ پائنتی میں بیٹھے ہوئے رمضانی نے اس کا پاؤں چوم کر آنکھوں سے لگا لیا تھا۔ اس نے کہا تھا ”میں چاہتی ہوں کہ ہم دونوں ایک ساتھ مریں کہ نہ میرا مرنا تم دیکھو، نہ تمہارا مرنا میں دیکھوں۔“

اتنی شان دار بیوی سے نفرت کسی بد نصیب ہی کو ہو سکتی تھی۔ رمضانی تو

بچوں کو بھی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ بس بیوی کا خیال رکھتا تھا۔ بچوں کا خیال تو بیوی رکھتی۔ ابھی میاں بیوی دونوں خیر سے تندرست و توانا تھے۔ اور رمضانی کو اپنی بیوی سے ہر طرح کی دلچسپی تھی۔

رمضانی کو اپنی بیوی سے کتنی محبت تھی اس کا اندازہ اس وقت ہوتا جب وہ باہر سے نشہ کر کے گھر آتا۔ ایک بات رمضانی میں عام نشہ خوروں سے الگ تھی۔ پینے کے بعد اس کے مزاج میں بڑی ٹھنڈک اور نرمی آجایا کرتی۔ بھٹی سے وہ سیدھا گھر پہنچتا خاموش اور گمبھیر۔ بچے سو چکے ہوتے یا پڑے کلبلایا کرتے۔ روکھا سوکھا جو پکا ہوتا بیوی آگے دھر دیتی اور خود سامنے بیٹھ جاتی۔ پھر رمضانی کی میٹھی میٹھی باتیں شروع ہوتیں۔ پیار اور لگاوٹ کی باتیں۔ اس وقت وہ بیوی کی ہر بات کو بے چوں وچرا مانتا جاتا۔ بیوی اس کی طبیعت پہچان چکی تھی۔ کام کی اور مطلب کی ہر بات وہ اس کے اسی موڈ میں کہا کرتی۔ اس کے نشہ پانی سے بیوی کو چڑ صرف اس لئے تھی کہ پیسے ضائع ہوتے تھے۔ ورنہ پی پلا کر وہ بیوی سے کوئی برا سلوک کرنے کا عادی نہیں تھا۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی مہربان ہو جایا کرتا۔

آج جب کہ اس کو اپنی بیٹی جمیلہ کے جوان ہو جانے کی بات بیوی سے معلوم ہوئی تو اس نے ہر روز سے زیادہ پی۔ اور ہر گلاس میں ہر بار اس کو ایک جوان لڑکی نظر آئی، دیوار سے لگی منہ پھیر کے سسکتی ہوئی ایک جوان لڑکی ـــــ چوری کا مال، جس کو وہ نہ گھر میں رکھ سکتا تھا نہ بازار میں لا سکتا تھا۔ رمضانی اس وقت تک پیتا رہا جب تک وہ لڑکی گلاس میں سے غائب نہ ہو گئی اور اس کی

جگہ میلے آنچل میں گیلے ہاتھ پونچھتی ہوئی، بڑی بڑی آنکھوں اور بھرے بھرے چہرے والی ایک خانہ دار عورت نہ آگئی۔

آج جب وہ گھر پہنچا تو خلاف معمول چوکھٹ پر اس کے قدم ایک بار لڑکھڑائے گھر کیا تھا، ایک بوسیدہ کمرہ تھا۔ ایک بڑا سا کمرہ جو اس نے شادی کے بعد یعنی اٹھارہ سال سے کرایہ پر لے رکھا تھا۔ تین روپے سے بڑھتے بڑھتے کرایہ دس روپے ماہوار تک جا پہنچا تھا۔ اور اب تو پٹنہ میں اتنا بڑا کمرہ بیس روپے کے کرایہ پر بھی ملنا ممکن نہ تھا۔ ایک چھوٹی سی انگنائی تھی جس کے ارد گرد اسی وسعت کے تین اور کمرے تھے۔ ہر کمرے میں ایک فیملی تھی۔ رمضانی ہی کے طبقہ کے بال بچہ دار لوگ۔ میاں، بیوی اور بچے جہاں حفظان صحت سے لے کر حفظان اخلاق تک کی کمی تھی۔ اخلاق کہنا غلط ہوگا۔ اگر حیا و حجاب، اخلاق سے الگ کوئی چیز ہو۔ مگر اللہ کے فضل سے اطمینان اس لئے تھا کہ وہاں تحفظ اخلاق عامہ وغیرہ کا پہرہ نہیں تھا۔ بس اپنے اپنے ضمیر اور اخلاق کا پہرہ تھا۔

رمضانی کے کمرے کے ساتھ پلنگ کی چوڑائی کا سائبان تھا جس سے باورچی خانے اور غسل خانے کا مصرف لیا جاتا تھا۔ رمضانی اور چھوٹے بچے تو باہر نل پر نہا لیتے تھے۔ البتہ اس کی بیوی اور بیٹی کو سائبان کی ضرورت پڑتی تھی۔ ویسے یہ لوگ نہاتے ہی کم تھے۔ سائبان سے ایک ٹاٹ کا پردہ لگا ہوا تھا جو کبھی اُٹھا اور کبھی گرا رہتا۔ رمضانی کا بستر ہر موسم میں یہیں رہتا تھا۔ یا رکھنا پڑتا تھا۔

آج چوکھٹ پر جب اسکے قدم لڑکھڑائے تو بیوی نے شک اور شکایت کی نظر سے دیکھا۔

"جمیلہ کی ماں رہنے دے۔ آج میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔" وہ بڑبڑایا۔

"سورپی کے آئے ہو تو کھاؤ گے کیسے!" بیوی نے طعنہ دیا۔ "آج کتنے دنوں بعد تو تمہارے لئے مچھلی پکائی ہے کتنے شوق سے۔ کھا لو پھر مہینوں نصیب نہیں ہونے کی۔"

"اچھا تو کہتی ہے تو کھا لوں گا۔" مچھلی کا نام سن کے اس کا جی للچایا۔ مسلسل ساگ سبزی کھاتے کھاتے وہ گوشت مچھلی کا مزا ہی بھول جاتا تھا۔ اور دودھ تو بس ماں کا ہی پیا تھا۔ بیوی نے کھانا لا کر آگے دھر دیا۔

آج رمضانی خلاف معمول چُپ چُپ سا تھا۔ بیوی کو پیار کی باتیں سننے کی عادت پڑ چکی تھی۔ شوہر کو خاموش دیکھ کر آج اس نے خود ہی بات چھیڑی۔

"کہو کیسی پکی ہے مچھلی؟"

"اچھی ہی ہے۔"

"بس صرف اچھی؟ اچھی تو کوئی بھی پکا سکتی ہے۔"

"چلو بہت اچھی ہے۔ تم خود بھی تو بہت اچھی ہو۔ آتے ہی غلام بنا لیا تم نے۔"

"آہستہ بولو۔ بچے جاگ رہے ہوں گے۔ تمہارے ڈر سے دبکے پڑے ہیں مگر آج تو تم پیسے دیئے بغیر ہی گھر سے نکل گئے تھے۔"

"ہاں۔ دے دیئے ہوتے تو اچھا ہی ہوا ہوتا۔ سارے پیسے خرچ ہو گئے۔ مگر آج تو حد ہو گئی جمیلہ کی ماں۔ لگتا تھا، پانی پی رہا ہوں۔"

"تمہیں میری جان کی قسم چھوڑ دو یہ پینا پلانا۔ کیسی محنت کی کمائی ہوتی ہے۔"

"چھوڑ تو دوں۔ میں بھی بہت چاہتا ہوں، مگر دل نہیں مانتا پاؤں خود

بخود بھٹی کی طرف اُٹھ جاتے ہیں۔ مگر جمیلہ کی ماں، میں ضرور چھوڑ دوں گا تم نہ کہو۔ خود بخود چھوڑ دوں گا۔ آج تو حد ہو گئی۔ دن بھر کی کمائی پی گیا۔ جمیلہ اور کلوا نے آج پیسے نہیں دیئے کیا؟"

"دیئے تو ہیں۔ مگر تھوڑے۔ جمیلہ کہتی ہے کہ آج کل برسات میں لوگ کیلے نہیں خریدتے۔ کچھ اور بیچوں گی۔ کلوا بھی کہتا ہے کہ لوگ آج کل ربڑ کے چپل اور جوتے زیادہ پہن رہے ہیں۔ پالش کا کام نہیں چلتا۔ سنو جی، ایک بات کہتی ہوں۔ سوچتی ہوں کہ جمیلہ کو اب گھر بٹھا دوں۔ زمانہ اچھا نہیں ہے۔ جوان جہان لڑکی ہے میں خود ہی کوئی سودا بیچ آیا کروں گی۔ گھر کا کام جمیلہ سنبھال لے گی۔" "کیسی باتیں کرتی ہو" رمضانی نے نوالہ روک کر کہا۔ "اتنے دنوں تو تمہیں پردے میں رکھا اور اب باہر نکال دوں کہ تم ٹوکری لیے گلی گلی ماری پھرو۔ یہ مجھ سے نہ ہوگا۔" پھر ذرا رک کر بولا۔ "عزّت کا معاملہ ہے لڑکی کی بات اور ہے۔ جی نہ مانے تو اسے بھی گھر بٹھا لو۔ بھلے بُرے گزارہ کر ہی لیں گے۔"

بیوی نے کوئی جواب نہیں دیا اور بڑی پیار بھری نظر سے رمضانی کو دیکھا۔ رمضانی نے ترنگ میں آ کر مسکراتے ہوئے اس کے گال میں ہلکی سی چٹکی لی۔ "چھی، توبہ کیسے بے شرم ہو جی۔ کچھ بچوں کا تو خیال کرو۔"

رمضانی نے بچوں کا جائزہ لیا۔ سب ہی ایک قطار میں سو رہے تھے۔ جمیلہ کنارے لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے بعد تینوں بھائی بہن تھے۔ دوسرے کنارے ماں کی خالی جگہ پڑی تھی۔ رمضانی کو کچھ کوفت محسوس ہوئی۔ وقت بے وقت اِن بچوں سے ایسے ڈرنا پڑتا تھا جیسے چور سپاہی سے۔

رمضانی نے آخری نوالہ نگل کر ہاتھ دھوئے بغیر ہی بیوی کا ہاتھ پکڑنا چاہا تو بڑی دھیمی آواز میں "ہٹو" کہہ کر بدکی اور برتن اٹھانے لگی۔

رمضانی نے پانی پیے بغیر ہاتھ دھوتے ہوئے احتجاج کیا "کیا لڑکی جوان ہوگئی تو ہم بوڑھے ہو گئے؟" جواب میں بیوی کے ہونٹوں پر ایک چور مسکراہٹ جھلملا کے رہ گئی۔

اور جب وہ سائبان میں اپنی چارپائی پر جاکر لیٹ گیا تو بیوی نے کمرے میں لالٹین کی بتی دھیمی کرتے ہوئے دور ہی سے پوچھا "ماچس بیڑی سب ٹھیک ہے کر دوں کچھ؟"

"سب ٹھیک ہے" رمضانی نے بیک وقت انگڑائی اور جمائی لیتے ہوئے کہا۔

باہر بدلیاں گھر آئی تھیں۔ ایک آدھ بار بادل گرجا، بجلی چمکی۔ پانی برسنے لگا۔ ذرا دیر کے بعد رمضانی کی آواز سنائی دی۔

"جمیلہ کی ماں بستر پر چھینٹے پڑ رہے ہیں ذرا اٹھ کر ٹاٹ گرا دے۔ مجھ سے اٹھا نہیں جاتا۔"

جمیلہ کی ماں اٹھ بیٹھی۔ سانس روک کر ایک نظر بچوں پر ڈالی، سب سو رہے تھے جمیلہ نے اس کی طرف پیٹھ اور دیوار کی طرف منہ کر رکھا تھا اور وہ دبے پاؤں سائبان میں ٹاٹ گرانے چلی گئی اور اسی وقت جمیلہ نے کروٹ بدل کر غنودگی کے عالم میں ہاتھ پاؤں کھینچے۔ سر اٹھا کر ماں کی خالی جگہ کو دیکھا اور جھٹ دیوار کی طرف منہ کر کے آنکھیں بند کر لیں۔

جمیلہ نے اپنے دل کو یقین دلایا "ماں، پردہ گرا کے پڑوسن سے گپ لڑانے

چلی گئی ہے۔" پانی برستا رہا۔ بادل ڈھنڈھناتا رہا......... بجلی چمکتی رہی، ہوا کا
ایک تیز جھونکا آیا تو لالٹین کی ٹمٹماتی ہوئی مدھم لو بجھ گئی۔ معلوم نہیں اندھیرے
میں جمیلہ کی آنکھیں کھلی رہیں یا بند ہوگئیں۔ مگر صبح ہوئی تو ماں نے اس کو
نیند میں ڈھیر پایا۔

اس دن کے بعد سے رمضانی نے جمیلہ کو پھر کبھی تھپڑ نہیں مارا۔ بلکہ ڈانٹ
پھٹکار بھی کم کردی۔ وہ دل ہی دل میں جمیلہ کی عزت کرنے لگا تھا۔ کیوں کہ اب
وہ سیانی ہو چلی تھی اور ہر بھلے برے کو سمجھنے کی تمیز اس کے اندر پیدا ہو چکی تھی۔
اس کے علاوہ ڈیڑھ دو روپیہ روز پھل بیچ کے کما بھی لیتی تھی۔ روپیہ ڈیڑھ روپیہ
تو کلّوا پیدا کرلیتا تھا۔ مگر وہ بڑا خرچیلا اور شوقین تھا۔ اس کی کمائی سے آٹھ
دس آنے ہی مل پاتے تھے

جمیلہ کے جوان ہوجانے کے احساس سے رمضانی فکرمند رہنے لگا تھا۔
اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس کے لئے لڑکا کیسے تلاش کرے۔ اِسے معلوم
ہی نہ تھا کہ کہیں شادی وغیرہ کی بات کس طرح چلائی جاتی ہے۔ اس معاملے
میں وہ پیدائشی بدھو تھا۔ بس بیوی کے ساتھ کھچڑی پکایا کرتا۔ اس
غریب کو تو کبھی وہم وگمان بھی نہ گزرا تھا کہ زندگی میں کوئی ایسا نازک موقع بھی
آئے گا۔

ایک دن اس نے بیوی سے بڑے ہی رازدارانہ لہجہ میں کہا۔ "جمیلہ کی ماں۔
میں نے ایک لڑکا دیکھا ہے۔ رکشا چلاتا ہے کبھی کبھی اس سے بھٹی میں ملاقات
ہو جاتی ہے۔ بڑا ہٹا کٹا ہے اور صورت شکل کا بھی اچھا ہے۔ واہ کیا بانکا جوان

ہے۔ تم کہو تو اس سے پوچھ لوں۔"

جمیلہ کی ماں کو ہنسی آ گئی۔ کہنے لگی "جیسے روح ویسے فرشتے۔ نظر بھی گئی تو ایک خانہ خراب پر جو غنڈہ تمہارے ساتھ بھٹی میں بیٹھ کے نشہ کرتا ہے اس سے بیٹی بیاہنے چلے ہو! —— وہ ہمارا داماد بنے گا! یہ آنکھوں دیکھی مکھی مجھ سے نگلی نہ جائے گی۔ چھی توبہ۔"

رمضانی کچھ برا مان کر تیز لہجے میں بولا۔ "پھر میں اس کے لئے سوٹ بوٹ والا بابو کہاں سے لاؤں؟ ذرا اپنی حیثیت بھی تو دیکھ نشہ ہی تو پیتا ہے۔ چلو میں اس سالے کو سمجھاؤں گا کہ نشہ پانی کی عادت چھوڑ دے تو تجھے اپنا داماد بنا لوں گا۔"

"صرف نشہ پانی ہی کی تو بات نہیں۔" بیوی نے رمضانی کی آنکھیں کھولیں "اس کا گھر خاندان، رہن سہن، سبھی کچھ دیکھنا پڑے گا۔"

"ہم ہی کون سے گھر خاندان والے ہیں۔" رمضانی تیکھا ہو کر بولا "مجھے تو آج تک اپنی ذات نہیں معلوم ہو سکی۔"

"پھر بھی اتنا تو دیکھنا ہی پڑے گا کہ اس کے ماں باپ کون ہیں۔ کیا کرتے ہیں۔ کہاں رہتے ہیں۔ کیا کماتا ہے، کیا بچاتا ہے۔ پٹنہ شہر میں کہیں چھپر تلے بھی سوتا ہے یا فٹ پاتھ پر پڑ جاتا ہے۔"

"چلو، سب معلوم کر لیں گے، اتنا تو میں جانتا ہی ہوں کہ بڑا کماؤ ہے۔ پانچ چھ روپے روز پیدا کر لیتا ہے۔ بڑے موج مزے میں گزارتا ہے۔ رہا نشہ پانی، سو میں کہہ سن کے چھڑا دوں گا۔ پہلے تو خود ہی چھوڑ دوں گا میری بات وہ بہت مانتا ہے۔"

”نام کیا ہے؟“

”ہو گا کچھ ویسے لّلن لّلن پکارتے ہیں۔“

”ہندو ہے یا مسلمان اتنا بھی جانتے ہو یا نہیں“؟

”کیسی باتیں کرتی ہو۔ پکّا مسلمان ہے۔ گلے میں یہ بڑا تعویذ لٹکتا ہے۔ دو چار حرف پڑھا لکھا بھی ہے۔ بڑی قابلیت کی باتیں کرتا ہے۔ ٹھیکے دار تو اُسے مولوی صاحب، مولوی صاحب کہتا رہتا ہے۔“

”ارے چولھے میں جھونکو اس مولوی صاحب کے بچّے کو۔ کوئی اور لڑکا دیکھو۔“

رمضانی چپ ہو گیا۔ آج پہلی بار بیوی کی بات دل کو نہیں لگی۔ وہ تو بس بکواس کرتی تھی۔ لڑکا رمضانی کی نظر میں کچھ جچ ہی گیا تھا۔ ایک تو مٹھی میں تھا ہی اب دوسرا وہ کہاں ڈھونڈتا پھرتا اس پر بھی وہ ابھی خیالی پلاؤ پکا رہا تھا۔ لّلن سے پوچھا نہیں تھا۔

پھر اس نے فیصلہ کن انداز سے کہا۔ ”تم کچھ بھی کہو جمیلہ کی ماں، مگر اپنی نظر تو لڑکے پر گڑ گئی ہے۔ میں کسی دن گھر لا کر دکھا دوں گا۔ تم بھی دیکھ لینا۔ لڑکا کوئی آسمان سے تو ٹپکتا نہیں۔ ویسے بھلائی برائی کس میں نہیں ہوتی۔“

جمیلہ کی ماں ہونٹ پچکا کے رہ گئی۔

اِدھر کچھ دنوں کے اندر جمیلہ میں ایک تغیر رونما ہوا تھا۔ وہ لباس کی صفائی اور کشش وغیرہ کی طرف دھیان دینے لگی تھی کچھ بننے ٹھنّے کا شوق بھی پیدا ہو چلا تھا کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بس ذرا دیر کو گھر سے نکلتی اور سارے کا سارا سودا بیچ

کے واپس آجاتی۔ جیسے کوئی اکھٹے ہی لے لیا کرتا ہو۔ اور اس کے برعکس کبھی ایسا ہوتا کہ صبح کی نکلی شام کو گھر واپس آتی ماں کئی بار ڈانٹ چکی تھی کہ سودا بچ رہے تب بھی جلدی گھر لوٹ آیا کرو۔ مگر جمیلہ طرح طرح کی تاویلیں پیش کر کے ماں کو چپ کر دیا کرتی۔

جس دن رمضانی نے آخری بار اس کو تھپڑ مارا تھا جمیلہ نے تین قصور کئے تھے۔ پہلا قصور یہ کہ جس وقت رمضانی انگنائی میں داخل ہوا وہ ایک واہیات سا فلمی گانا گنگنا رہی تھی۔ دوسرا قصور یہ کہ وہ ہمیشہ سے زیادہ دیر کر کے گھر لوٹی تھی۔ تیسرا اور سب سے سنگین قصور یہ کہ وہ ماں کو بتائے بغیر اپنے لئے پہلی بار پوڈر، لپ اسٹک وغیرہ خرید کر لائی تھی۔ رمضانی کو یہ لچھن برے ہی نہیں بڑے ہی خطرناک بھی لگے۔ اور اس نے دو چار موٹی موٹی گالیاں دے کر ایک تھپڑ رسید کر دیا تھا۔ کہیں اسے یہ بھی پتہ چل جاتا کہ کلنکنی نے میٹنی شو میں جا کر فلم بھی دیکھی تھی تو شاید بورے میں بند کر کے گنگا میں پھینک آتا۔

مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ جمیلہ کی طرف سے رمضانی کا ذہن صاف نہیں تھا۔ وہ تو کوئی بری بات سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ بڑی ہو گئی تو کیا ہوا۔ ابھی اِس معصوم کا سن ہی کیا تھا۔

وہ تو جمیلہ کی ماں کے کہنے پر جان سکا تھا کہ وہ بالغ ہو چکی تھی اور شادی کے قابل تھی۔ پھر بھی کچھ ایسا سن تو نہ تھا کہ جگ ہنسائی کا ڈر ہو۔ رمضانی کا سر فخر سے اونچا تھا کہ اس کی بیٹی پاس پڑوس میں نہایت نیک، پارسا اور شرمیلی مشہور تھی۔ ورنہ رمضانی جیسے لوگوں میں تو اس عمر کی لڑکیاں کتنے ہی گھیرے

پھلانگ چکی ہوتی ہیں۔ رہی چھپے چوری فلم دیکھنے والی بات تو وہ بس ایک شوق تھا۔ دل نہ مانا تو چلی گئی اور بعد میں ماں کو بتا بھی دیا تھا۔ وہ بھی اکیلی نہیں بلکہ ایک عورت کے ساتھ جس سے اس کی نئی نئی جان پہچان ہوئی تھی۔ کیوں کہ وہ عورت بھی پھل بیچا کرتی تھی، جمیلہ پر اُنگلی اُٹھانے کی کسی میں ہمّت نہ تھی ایسے بننے ٹھننے کا شوق کس جوان لڑکی میں نہیں ہوتا۔ محلہ کی تو کتنی ہی لڑکیوں کے قصّے مشہور تھے۔ مگر جمیلہ بے داغ تھی۔

رمضانی نے للّن سے اصل بات کا تو ذکر نہیں کیا۔ البتّہ باتوں باتوں میں اس کو اپنے گھر کھانے کی دعوت پر راضی کر لیا۔ اتفاق سے وہ عید کا دن تھا۔ جمیلہ کی ماں نے للّن کو اچھی طرح دیکھا بھالا۔ لڑکا پسند آگیا۔ تیز تھا۔ کماؤ تھا۔ صورت کا بھی اچھّا تھا۔ مگر وہی ایک بات کہ ساری کمائی نشہ پانی میں اُڑا دیتا تھا۔ اگر وہ اس عادت کو ترک کر دیتا تو جمیلہ کی ماں کو کوئی اعتراض نہ ہوتا۔

رمضانی اور للّو دونوں کہیں سے پی کر دعوت کھانے آئے تھے۔ کھا کر دونوں ساتھ ہی گھر سے نکلے۔ جتنی دیر للّن گھر میں رہا جمیلہ پڑوسن کے کمرے میں رہی جمیلہ کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ اس کی ماں نے بڑی چالاکی سے اس کو پڑوسن کے پاس بھیج کر جھوٹ موٹ کے کام میں پھنسا دیا تھا تاکہ للّن اس کو نہ دیکھ سکے اور نہ وہ للّن کو دیکھ پائے۔ کیوں کہ اصل بات ابھی صیغہ راز میں تھی۔

راہ چلتے باتوں باتوں میں للّن نے رمضانی کو ازراہ محبت آمدنی بڑھانے کا ایک خفیہ گر بتایا۔ رمضانی ذرا ہچکچایا تو وہ بولا ـــــ "رمضانی چچا، شرافت وغیرہ کی تو ایسی تیسی۔ اس دنیا میں شرافت کا مول ہی کیا ہے۔ شریفوں کو تو بھیک

بھی نہیں ملتی۔ چاچا، دیکھو میں نے تو ایک ایک دن میں دس دس پندرہ پندرہ روپے انٹی میں ڈالے ہیں۔ آج کل بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ رکشا چلاتے چلاتے مر جاؤ گے پر کچھ نہ ہوگا۔ میلی قمیص اور پھٹی لنگی سے آگے نہ بڑھ سکو گے۔ میں نے ایک فلم میں سُنا تھا کہ غریبی کا دوسرا نام شرافت اور تیسرا نام انسانیت ہے۔ چلو، میں کل ہی تمہارے لئے سب ٹھیک ٹھاک کر دیتا ہوں۔ دیکھنا پیسہ کس طرح آتا ہے۔ محنت اور پسینہ کی کمائی سے تو پیٹ بھی نہیں بھرتا۔ اگر محنت کا مول ہوتا تو اینٹیں ڈھونے والا ہر سال اپنی بھی ایک بلڈنگ کھڑی کر لیتا۔ کل دن کے ٹھیک بارہ بجے تم تھانہ والے چوراہے پر موجود رہنا۔ اور اشارہ پاتے ہی میرے پیچھے ہو لینا۔

للن کی اس تقریر نے رمضانی کو متاثر کیا۔ دس دس اور پندرہ پندرہ والی بات سن کر جسم میں ایک تولہ خون تو اسی وقت بڑھ گیا۔ پھر بھی جی کچھ ہچکچایا۔ مگر وہ نیم راضی ہوگیا۔ دوسرے دن بارہ بجے رمضانی تھانہ والے چوراہے پر رکشا کے ساتھ موجود تھا۔

ذرا دیر کے بعد اس نے دیکھا کہ للن بڑی تیزی میں رکشا لئے چلا آرہا تھا۔ مگر رکشا خالی نہیں تھا۔ گرا ہوا پردہ ظاہر کر رہا کہ اس پر زنانی سواری تھی۔ قریب پہنچ کر للن نے پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ رمضانی چل پڑا۔ کئی محلوں اور گلیوں سے گزرنے کے بعد ایک ہوٹل کے دروازے پر للن نے رکشا روک کر پردہ اٹھا دیا۔ دو زنانی سواریاں بجلی کی سی تیزی سے اتر کر اندر چلی گئیں۔ رمضانی ان دونوں کو ٹھیک سے نہ دیکھ سکا۔ البتہ اتنا اندازہ ضرور ہوگیا کہ ایک ادھیڑ اور دوسری جوان تھی۔ بس یہی کچھ جمیلہ کا سن وسال رہا ہوگا۔ اُسے

محسوس ہوا کہ یہ آدھا چہرہ اس نے پہلے بھی کہیں دیکھا تھا۔

للّن نے رکشا کنارے سے ہٹاتے ہوئے کہا ——— "آؤ چاچا دو گھونٹ چڑھا آئیں۔ ابھی یہ سالیاں گھنٹے دو گھنٹے یہاں موج مزا کریں گی۔ پھر ہم واپس آکر انھیں ٹھکانے پر چھوڑ آئیں گے۔ ایک کو میں ایک کو تم۔ ابھی دو تین اور ہیں۔ سب سے جان پہچان کرا دوں گا۔"

"کیا یہ دونوں چوک والیاں ہیں؟" رمضانی نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں! چوکھٹ والیاں ہیں۔ اب تو گلی گلی میں چوک آباد ہے چاچا!"

دو گھنٹے بعد دونوں واپس آئے۔ للّن اس کو ہوٹل کے اندر لے گیا۔ ایک کمرے کے پاس پہنچ کر اس نے آواز دی تو ایک ادھیڑ عورت نے اندر سے جھانکا۔ پھر باہر نکل آئی۔ للّن نے اس سے رمضانی کا تعارف کرانے کے بعد کہا ——— "اس کا اڈا ہماری بھٹی کے پاس ہی ہے۔ پھل بیچتی ہے۔ جب کوئی گاہک پھنسے اس کو لے کر پہنچ جانا۔ یہ سب ٹھیک ٹھاک کر دے گی۔ اس کے پاس ایک سے ایک نمونہ ہے۔" پھر اس عورت سے بولا "ذرا اس نخرے والی کو تو باہر نکالو۔ چاچا سے جان پہچان کرا دوں۔"

عورت جب اس لڑکی کو بلانے گئی تو وہ کمرے کے ایک کونے میں گنوارن کی طرح سمٹی سمٹائی کواڑ کی طرف پیٹھ کیے بیٹھی تھی اور گاہک نکل بھاگنے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ لڑکی کچھ گھبرائی ہوئی تھی۔ حالانکہ وہاں کوئی ایسی بات تو نہ تھی۔

عورت نے لڑکی کو ٹوکا ——— "اس نئی ساڑی کا کیوں ستیاناس

کر رہی ہے۔ چل کے اپنی ساڑی پہن لینا تو سڑک پر لوٹتا۔ بستر چھوڑ کے زمین پر بیٹھی ہے۔ پگلی! اتنی ڈری ہوئی کیوں ہے؟"

اس عورت نے ذرا دیر بعد باہر آ کر للّن سے کہا — "بہت شرماتی ہے۔ باہر نہیں آتی۔ خیر ٹھیک ہے۔" پھر رمضانی سے مخاطب ہوئی "جب کام پڑے آجانا۔ میں سب ٹھیک ٹھاک کر دوں گی۔"

للّن کو اس فضول سی شرم و حیا سے کچھ کوفت محسوس ہوئی۔ مگر یہ لڑکی چوں کر اس پر مہربان تھی اس لئے اس پر دباؤ ڈالنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس کو ڈر تھا کہ وہ لڑکی کہیں برا مان کر ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ پھر اس نے سوچا کہ نئی نئی راہ پر لگی ہے اس لئے ہر کسی کے سامنے آتے جھجکتی ہے۔ اس نے رمضانی کو سمجھایا — "چھوڑو چاچا۔ نخرے باز ہے سالی۔ مگر تم سے کب تک چھپے گی۔ کسی دن گاہک پھنسا لاؤ پھر سارا نخرا دھرا رہ جائے گا۔ دیکھو چاچا اب کسی شوقین بابو سے نہ کہنا کہ صاحب ہم یہ رنڈی بھڑووں کا دھندا نہیں کرتے۔ جس نے کی شرم اس کے پھوٹے کرم۔"

رمضانی اس کی باتیں توجہ اور دلچسپی سے سن رہا تھا۔ مگر اندر والی لڑکی کو ایک نظر دیکھنے کی خواہش دل کو گدگدانے لگی تھی۔ اس کے آدھے چہرے کی ایک ہلکی سی جھلک جو پلک جھپکتے میں وہ دیکھ پایا تھا۔ اس کے نقوش رہ رہ کے ذہن میں ابھر رہے تھے۔ اور نہ جانے کیوں ان مبہم نقوش سے اس کا ذہن ایک مکمل شکل بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دل نہ مانا تو اس نے بے دھڑک ایک قدم کمرے کی چوکھٹ کے اندر ڈال دیا۔ مگر لڑکی منہ پھیرے

چوکھٹ کی طرف پیٹھ کئے ہوئے تھی اور گاہک اس کے ہاتھ میں شاید نوٹ تھمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر لڑکی کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔

"ارے چھوڑو بھی چاچا"، للّن نے فوراً ٹوکا "وہ تو خود ہی تمہارے پیچھے پیچھے ماری پھرے گی۔ ہاں دیکھو، یہ سب کام پھرتی کے ہوتے ہیں۔ دیر نہ کرو۔ تم آگے نکل چلو۔ میں ذرا حساب کتاب کر کے ان دونوں کو اڈے پر چھوڑ کے آتا ہوں۔ وہیں ملنا۔ تھانے کے پاس۔"

رمضانی چپ چاپ باہر نکل گیا۔

اس رات رمضانی بھٹی نہیں گیا۔ بیوی حیران تھی۔

وہ اپنی چارپائی پر کسی گہری سوچ میں پڑا تھا۔ بیوی کے بار بار کرید کرنے پر کہنے لگا "کیا بتاؤں جمیلہ کی ماں، عجب خدا کی قدرت ہے میں نے ایک لڑکی کو دیکھا۔ اپنی جمیلہ جیسی لگتی تھی۔ ٹھیک سے دیکھ نہیں پایا۔ بس آدھا ہی چہرہ دیکھ سکا۔ وہ بھی بجلی کی چمک کی طرح۔"

"اس میں عجیب بات کیا ہے؟ ملتی جلتی شکلیں بہت سی ہوا کرتی ہیں۔ مگر دیکھا کہاں؟"

"توبہ کرو۔ بڑی خراب جگہ۔ کیا بتاؤں، بری بات ہے۔" ذرا رک کر پھر بولا "میرا تو جی ڈر گیا ہے جمیلہ کی ماں۔ طرح طرح کا خیال دل میں آتا ہے۔ جمیلہ کا باہر نکلنا بند کر دینا چاہیئے۔ کیا بھروسہ، کہیں اس کو زمانے کی ہوا لگ جائے!"

جمیلہ قریب ہی بیٹھی توے پر تیسری روٹی سینک رہی تھی۔ باپ کی

بات سن کر کلیجہ دھڑکنے لگا تھا اور سدھ بدھ کچھ ایسی بسری تھی کہ اس نے روٹی کے بجائے تپتے ہوئے توے کو چٹکی میں پکڑ لیا اور چیخ مار کر تڑپ اٹھی۔ ماں، باپ، بھائی بہن، سبھی اس کی چیخ پر ہڑبڑا گئے۔ جمیلہ پسینہ پسینہ ہو کر اس طرح ہانپنے لگی جیسے دل اچھل کر حلق میں آجائے گا۔

ذرا دیر بعد جب حادثہ کا اثر زائل ہو گیا تو رمضانی پھر کہنے لگا ”بڑی نازک بات ہے جمیلہ کی ماں۔ للن کو گولی مارو“ پھر اس نے بڑی پراسرار نظر سے جمیلہ کو دیکھکر کہا ”اتنی اچھی لڑکی کا ہاتھ اتنے برے آدمی کے ہاتھ میں نہیں دے سکتا۔“

جمیلہ کی جلی ہوئی انگلی میں تو ٹھنڈک پڑ گئی مگر دل میں ایک چنگاری سی جا پڑی۔ اور وہ یہ غور کرنے لگی کہ اس نے باپ کو نہیں سمجھا یا باپ نے اس کو نہیں سمجھا ہے

عورت کا تیسرا جنم

اسے اتفاق کی ستم ظریفی ہی کہیے کہ جو نام پروفیسر شمیم کا تھا اسی نام کی بیوی بھی مل گئی۔ پروفیسر شمیم نے کوفت، مگر اس کی بیوی نے دلچسپی محسوس کی۔ در اصل ان دونوں نے طبیعت ہی کچھ الگ الگ پائی تھی یا اجتماعِ ضدین ایک حادثہ ہی تھا۔ پہلے پروفیسر شمیم شادی کا قائل نہیں تھا۔ اس نے تو کنوارا ہی مرنے کی ٹھان رکھی تھی۔ مگر وہ کاجل کی کوٹھری والی بات مشہور ہے۔ تو زندگی ایک کوٹھری ہے اور عورت اس کا کاجل۔ کتنا ہی دامن بچاکے رکھو۔ کاجل کہیں نہ کہیں، کبھی نہ کبھی لگ کے رہے گا۔

یہی بات پروفیسر شمیم کے ساتھ ہوئی ہزار بچانے کے باوجود دامن پر کاجل کا دھبہ پڑ ہی گیا۔ یہ عورت ایک حادثہ بن کر پروفیسر شمیم کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔

شمیم اور اس کی بیوی کی نفسیات میں فرق تھا۔ پروفیسر شمیم بہت

دنوں سے اپنی زندگی کا ایک شان دار مقبرہ تعمیر کرنے میں مصروف تھا۔ جب کہ اس کی بیوی اپنی زندگی کی خوشیوں کا محل تعمیر کرنا چاہتی تھی۔ کیوں کہ وہ زندگی کی حسین حقیقتوں اور دل لبھانے والے جلوؤں کی شیدائی تھی۔

پروفیسر شمیم برسوں سے آواگون کے چکر میں پھنسا ہوا تھا۔ اور اس پر جنم کے ریسرچ کر رہا تھا۔ اس کو شک نہیں بلکہ یقین تھا کہ یہ اس کا دوسرا جنم ہے۔ کیوں کہ پچھلے جنم کی مردہ یادداشتیں کبھی کبھی اس کے دماغ کی قبر میں کلبلایا کرتی تھیں۔ ایک بار تو اس کو یہاں تک یقین ہو چلا تھا کہ اس کی پہلی پیدائش گوتم بدھ کے عہد میں ہوئی تھی۔ غرض ماضی کی قبر کھودنا اور مستقبل کا چھلاوا پکڑنا اس کا مستقل شغل تھا۔ جس میں وہ رات دن مستغرق رہا کرتا۔ حال سے اس کو دلچسپی نہیں تھی۔ چونکہ اس کو آواگون پر یقین تھا۔ اس لئے وہ اس اندیشے میں دبلا ہوا جاتا تھا کہ اس کو قیامت تک بار بار پیدا ہوتا رہنا پڑے گا۔ جب اس کی شادی والا واقعہ زندگی میں رونما ہوا تھا ان دنوں وہ اس بات کا ٹوہ لگانے میں منہمک رہتا تھا کہ کس طرح مرا جائے کہ اگلا جنم کسی الف لیلائی سلطنت کے ولی عہد کی حیثیت سے ہو۔ وہ جو ایک دھڑکتی اور سلگتی ہوئی زندہ "الف لیلہ" قسمت نے اس پر مسلط کر دی تھی۔ اس سے بس رسمی اور واجبی سی دلچسپی رہ گئی تھی۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز بات تو یہ تھی کہ اس کی خوب صورت اور تیز و طرار بیوی نے ساری باتوں سے باخبر ہوتے ہوئے بھی اس کو شوہر کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا۔ احباب کا خیال تھا کہ بیوی کو شوہر کی مخبوط الحواسی ہی سے عشق تھا۔ تبھی تو وہ بڑے فخر سے کہا کرتی تھی "یہ شمیم صاحب کی بے خودی ہی تو تھی

جو پہلی ہی نظر میں کام کر گئی۔ اگر یہ نہ ہوا ہوتا تو اپنی خودی کا جنازہ نکل چکا ہوتا۔" اور کبھی بڑے خلوص سے اس حسرت کا اظہار کیا کرتی۔

"خدا کرے یہ اگلے جنم میں بھی میرے حصے میں آئیں۔"

"آنکھیں ملیں، محبت ہوئی، شادی ہوگئی ـــــ" دنیا کی مختصر ترین پریم کہانی صرف ایک جملہ یعنی چھ الفاظ میں! یہ کہانی اتنی مختصر اس لئے ہوگئی کہ ایک پہنچے ہوئے آدمی شاطر نے مس شمیم کا تعارف یوں کرا دیا "آواگون پران کی معلومات بہت وسیع ہیں۔ یہ ان کا تیسرا جنم ہے اور پچھلے دو جنموں کی یادداشتیں ان کے ذہن میں مذہبی کتابوں کی طرح محفوظ ہیں۔"

مس شمیم جھٹ بول پڑی۔ "جی ہاں، میری غیر مشتبہ یادداشت کے مطابق میرا پہلا جنم کورو پانڈو کے زمانے میں ہوا تھا۔ اور دوسرا جنم دور مغلیہ میں انارکلی کے روپ میں۔"

"پہلے جنم میں آپ کیا تھیں؟" پروفیسر شمیم بڑے اشتیاق سے پوچھ بیٹھا۔

"رانی تھی" مس شمیم نے بتایا۔ "پہلے کورو کی رانی تھی۔ پھر لڑائی ہوئی تو پانڈو مجھے اٹھا کر لے بھاگا اور اپنی رانی بنا لیا۔ کچھ دنوں کے بعد دونوں میں صلح ہو گئی تو دونوں نے نصفا نصف پر بٹوارہ کر لیا۔"

"چھ مہینے ایک کی رانی اور چھ مہینے دوسرے کی۔ اس زمانے میں شادی بیاہ کا رواج نہیں تھا۔ مگر ساجھے داری کا یہ سلسلہ زیادہ عرصے تک نہیں چل سکا۔ چوں کہ اس زمانے میں کیلنڈر ایجاد نہیں ہوا تھا اس لئے دنوں کے حساب کتاب میں گڑبڑ ہو گئی۔ دونوں کو شک گزرا کہ میں ایک کے ساتھ کم

اور دوسرے کے ساتھ زیادہ رہا کرتی تھی۔ لڑائی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ پنچایت نے فیصلہ کیا کہ میں بیک وقت دونوں کے ساتھ رہوں۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ پھر میرے ایک چاند سا بیٹا پیدا ہوا۔ کورو نے کہا میرا ہے۔ پانڈو نے کہا میرا ہے۔ اور اسی بات پر دونوں لڑتے لڑتے مر گئے۔ اگر سچی بات ظاہر ہو جاتی تو دونوں نے مل کر مجھے ہی مار ڈالا ہوتا۔ وہ سچی بات آج کے لئے تو بڑی شرم کی ہے مگر اس زمانے میں شرم وغیرہ کا جنم نہیں ہوا تھا ـــــــ شرم کی پیدائش تو انسان کے بہت بعد ہوئی ہے۔"

"وہ تیسرا خوش نصیب کون تھا؟" کسی نے چٹکی لی۔ مگر مس شمیم نے سنجیدگی ہی سے جواب دیا "نام یاد نہیں شکل یاد ہے جو پروفیسر شمیم سے ایک دم ملتی تھی۔ البتہ اس کے ہونٹ اتنے حسین نہیں تھے۔"

احباب ہنس پڑے پھر بھی وہ اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہتی رہی۔

"یہی کشش تو مجھے یہاں تک کھینچ لائی ہے۔ کل میں نے اخبار میں پروفیسر شمیم کی تصویر دیکھی جوان کے ریسرچ کے سلسلے میں شائع ہوئی ہے۔ اس تصویر پہ نظر پڑتے ہی اپنے پہلے جنم کا پورا دور فلم کی طرح آنکھوں میں پھرنے لگا۔"

پروفیسر شمیم تصویر حیرت بنا اس کا منہ دیکھتا رہا۔ اور دل ہی دل میں اس گتھی کو سلجھاتا رہا کہ اس کا پچھلا جنم گوتم بدھ کے دور میں ہوا تھا یا کورو پانڈو کے زمانے میں۔

"یہ تو بتائیے مس شمیم کہ دوسرے جنم میں کیا واقعی آپ کو دیوار میں چن دیا گیا تھا؟"

ایک مہمان نے دل چسپ سوال کیا۔

"کیا کیجیے گا۔ جان کر" مس شمیم سنجیدگی سے مسکرائی "دیوار میں چُن دینے والی بات تو محض افسانہ ہے۔ دراصل اکبرِ اعظم نے تنگ آکر میری شادی خفیہ طور پر لاہور میں ایک ایسے شخص سے کرا دی تھی۔ جو شہزادہ سلیم سے کہیں زیادہ خوب صورت تھا۔ اِدھر شادی ہوئی اُدھر عشق کافور ہوا۔ شادی ہمیشہ سے عشق کا توڑ کرتی آئی ہے۔ اس معاملہ میں اکبر بادشاہ کا ریکارڈ بہت خراب ہے جب شہزادہ نے مہرالنساء، عرف نور جہاں، پر ڈورے ڈالے تو اکبرِ اعظم نے جھٹ اس کی شادی شیر افگن خاں سے کرکے بنگالہ بھیج دیا۔ مگر شہزادہ سلیم عاشق صادق تھا۔ برسوں کی بیاہی محبوبہ کو پھر سے قبول کر لیا۔"

ایک منٹ کے لئے محفل پر سکوت طاری رہا۔ شاطر ایک نظر مس شمیم کو تو ایک نظر پروفیسر شمیم کو دیکھتا رہا۔ شاطر اور مس شمیم آپس میں تو ایک دوسرے سے واقف تھے مگر اس محفل میں اجنبی تھے جو پروفیسر شمیم کی کوٹھی میں جمی ہوئی تھی۔ دراصل شاطر ہی نے مس شمیم کی یہاں تک رہنمائی کی تھی۔ کیوں کہ اسے یقین تھا کہ پروفیسر اور مس شمیم ایک دوسرے سے مل کر ضرور خوش ہوں گے۔

شاطر نے بڑی تہذیب اور سنجیدگی سے سوال کیا۔ "اگر برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں۔ کیا موجودہ جنم میں آپ کو شاہزادہ سلیم یا اس کے رقیب روسیاہ یعنی آپ کے شوہر سے ملتی جلتی کوئی شکل نظر آئی؟"

مس شمیم بولی "کل تک تو نہیں، مگر آج ایک شکل نظر آئی۔ پوری شکل تو نہیں۔ بس ہونٹ شاہزادہ سلیم سے ملتے ہیں۔ اگر آپ لوگ اسے خوشامد

یا مذاق نہ سمجھیں تو بتاؤں"۔

پروفیسر شمیم نے انتہائی اشتیاق میں پھڑک کر اطمینان دلایا "آپ کہہ گزریئے۔ یہاں مذاق اور خوشامد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"۔

مس شمیم نے شاطر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا "اتفاق سے وہ ہونٹ پروفیسر شمیم ہی کے ہیں"۔

اس لمحہ پروفیسر شمیم کے ریسرچ زدہ چہرے پر ایک ثانیہ کے لیئے جو سُرخی دوڑی وہ کسی سے چھپی نہ رہ سکی۔ پھر آنکھوں میں جھینپ اور ہونٹوں پر پانی کی لہر جیسی مسکراہٹ آئی۔

یہ پروفیسر شمیم کے اُجلے دامن پر کاجل کی کوٹھری کی پہلی نشانی تھی جو آخری بھی ثابت ہوئی۔

اب اس نے مس شمیم کی باتوں کے ساتھ ساتھ مس شمیم کی شخصیت بلکہ مس شمیم کے سراپا میں بھی کشش محسوس کی۔ ایک زندہ دل مہمان نے دلچسپی پیدا کرنے کے خیال سے کہا "معاف کیجئے گا مس شمیم۔ آپ نے دوسری بار پیدا ہونے میں بڑی دیر لگائی۔ کہاں کورو پانڈو کا زمانہ اور کہاں دور مغلیہ اس بیچ میں آپ کو ایک بار ضرور پیدا ہونا تھا"۔

پروفیسر شمیم اور مس شمیم کے علاوہ باقی حاضرین ہنس پڑے۔

مس شمیم اپنے موڈ کو بدستور برقرار رکھتے ہوئے کہنے لگی "پیدا ہوئی تو ہوتی مگر ایک اڑچن پڑ گئی، قسمت نے ساتھ نہیں دیا۔ ورنہ شہزادی بن کے پیدا ہوئی ہوتی ــــ پیدائش کا وقت قریب پہنچ چکا تھا کہ وہ ملکہ ہی زہر کھا کے مرگئی جو مجھے

جنم دینے والی تھی۔ لہٰذا میں واپس لوٹ گئی۔ یہ واقعہ بغداد میں الہ دین، علی بابا وغیرہ کے زمانے میں پیش آیا ہوگا۔ میرا قیاس یہی کہتا ہے۔"

اس بات پر پروفیسر شمیم کی الف لیلائی سلطنت کے ولی عہد والی خواہش بھڑکی۔ اور اس نے اپنی گردن کو مس شمیم کی کمر سے باتیں کرتی ہوئی زلفوں کے پھندے میں محسوس کیا۔ اس کے دل نے کہا کہ ایک بار جب لب بام آ کے کمند ٹوٹ چکی ہے تو اب اگلی بار شہزادی پیدا ہو کے رہے گی۔ کیا عجب کہ دونوں کے اگلے جنم کا زمانہ ایک ہی ہو۔

پھر ادھر ادھر کی خوش گپیوں کے بعد جب مہمان رخصت ہونے لگے۔ تو پروفیسر شمیم نے مس شمیم سے درخواست کی "آپ دونوں کھانا ہمارے ساتھ کھائیں تو کیا مضائقہ ہے — ہم دونوں ہم سفر ہیں۔ کچھ تبادلۂ خیال کریں گے آپ سے ریسرچ میں کافی مدد مل سکے گی۔"

مس شمیم نے بات رکھ لی۔

شاطر نے دونوں کے درمیان روایتی مصاحب کا کردار ادا کرتے ہوئے پروفیسر شمیم کو آناً فاناً مس شمیم کی محبت میں مبتلا کر دیا۔ اور اشاروں میں ایک پانسہ پھینکا "اگر ایک مبارک بات ممکن ہو جاتی تو واقعی یہ جوڑی نہ صرف شہر میں بلکہ زمانے میں آئیڈیل کہلاتی۔"

"مبارک بات" والا اشارہ اتنی ہی تیزی سے پروفیسر شمیم کی سمجھ میں آیا جتنی جھجک سے شاطر نے یہ تجویز پیش کی تھی۔ اس نے نہایت خلوص اور سچائی سے فوراً اپنے دل کی بات کہہ دی۔ "میں نے کنوارا ہی مرنے کی ٹھان لی تھی۔

مگراب شاید ایسا نہ ہو سکے گا۔"

شاطر نے رخصت ہوتے ہوئے ہنستے ہنستے کہا۔ "خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔ اگر واقعی ایسا ہو گیا تو شاید آج کا دن میری زندگی کا سب سے بڑا دن ہوگا۔"

پہلی بار مس شمیم کے ہونٹوں پر ایک البیلی شرمیلی مسکراہٹ تھرتھرائی۔ ان ہونٹوں پر ــــ جن کی دوستوں میں قسم کھائی جاتی تھی۔

اس واقعہ کے تیسرے ہی دن شادی ہو گئی۔ شادی ہونے میں دھرا ہی کیا تھا ــــ قاضی کو بلوا کر پروانہ راہداری حاصل کر لینا تھا۔ مگر شاطر اور شمیم نے احتیاطاً قانونی رجسٹریشن بھی کرا لیا۔ پروفیسر شمیم نے مس شمیم کے پس منظر کے بارے میں اتنی معلومات کو ہی کافی سمجھا کہ وہ دو بار پہلے پیدا ہو چکی تھی تیسری بار پیدا ہوتے ہوتے رہ گئی تھی اور چوتھی بار تو گویا پروفیسر شمیم سے نام اور "جنم کنڈلی" ملا کر ہی پیدا ہوئی تھی۔ پروفیسر کو آم کھانے سے غرض تھی۔ پیڑ گننے سے کیا کام۔ حالانکہ ایک زمانہ شناس دوست نے یہاں تک وارننگ دی تھی۔ کہ یہ کوئی چارسو بیس عورت معلوم ہوتی ہے۔ مگر پروفیسر شمیم اس بات کو خاطر میں نہ لایا۔ چوں کہ یہ منہ پھٹ دوست آواگون کے فلسفہ کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ اس لئے پروفیسر شمیم نے سمجھا کہ وہ شادی میں نہیں بلکہ اس کے مشہور و معروف ریسرچ میں بادھا ڈالنا چاہتا تھا۔ اور اس کا بدلہ یوں لیا کہ شادی کا ڈنر کارڈ اس کو نہیں بھجوایا۔

ڈنر کا اہتمام بڑے اعلیٰ پیمانے پر کیا گیا۔ مہمان تو گنے چنے تھے مگر انتظام ایسا

تھا کہ جنت کا مزا آجائے۔ یہ شاندار انتظام مسز شمیم اور شاطر کے ہاتھوں ہوا تھا۔

ڈنر میں بڑی دلچسپی اور خوش گپیاں رہیں۔ آج لوگوں نے پروفیسر شمیم کو بار بار مسکراتے ہوئے دیکھ پایا۔ کیوں نہ ہو عورت جو زندگی میں آگئی تھی۔ ورنہ پروفیسر شمیم نے یہ سوچ رکھا تھا کہ دنیا نے ایک بار اس کو روتے ہوئے اس وقت دیکھا تھا جب وہ پیدا ہوا تھا اور مسکراتے ہوئے اس وقت دیکھے جب وہ مر رہا ہو۔ چنانچہ پوری زندگی میں وہ کبیر داس کا یہ شعر یاد کر پایا تھا۔

؎ کبیر جب تم دنیا میں آئے جگ ہنسا تم روئے
ایسی کرنی کر چلو کر تم ہنسو جگ روئے

اس کے علاوہ اس کو دنیا کی کسی زبان کا کوئی شعر یاد نہیں تھا۔ البتہ اب مسز شمیم کی شاعرانہ باتوں نے اس کی تلافی شروع کر دی تھی۔ مثلاً ڈنر کے بعد کی خوش گپیوں میں شاطر نے کہا۔

"مسز شمیم، کیا ہی اچھا ہو کہ آپ اپنے نام کے شروع میں یا آخر میں کوئی حرف بڑھا لیں تاکہ آپ دونوں میاں بیوی کے نام میں کچھ تو فرق پیدا ہو، جیسے شمیمہ، شمامہ وغیرہ۔"

مسز شمیم اپنے شوہر کو شوخی اور پیار سے دیکھ کر چہکی "میں اپنا خوشبو دار نام کسی قیمت پر ترک نہیں کر سکتی۔ شمیم تو مؤنث ہے۔ پروفیسر صاحب ہی کو اپنے نام پر نظر ثانی کر لینا چاہیئے مگر اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ جب زندگی ساجھے دار ٹھیری تو نام میں بھی سہی۔"

مسز شمیم کی یہ بات مزا دے گئی۔

کافی رات گئے مسز شمیم نے مہمانوں کو رخصت کرتے ہوئے اعلان کیا کہ

"ہنی مون سے واپسی پر دوستوں کو ایک اور ڈنر دیا جائے گا۔"

مگر ہنی مون کے بعد ڈنر کی نوبت نہیں آئی۔ پروفیسر شمیم پر یہ راز بہت جلد فاش ہو گیا کہ مسز شمیم کو آواگون کے مسئلہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ اس فلسفہ پر اس کا کوئی مطالعہ تھا۔ وہ بس زندگی اور جوانی کا ایک اُبلتا ہوا چشمہ تھی۔ اور یہ چشمہ پروفیسر کی خشک زندگی کے علاوہ ساری دنیا کو سیراب کر سکتا تھا۔ کیوں کہ جنس اور جسم میں پروفیسر کو والہانہ کشش نہیں تھی، جبکہ مسز شمیم یہی دو چیزیں لے کر اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی مگر دو ماہ کا طویل ہنی مون ختم ہوتے ہوتے پروفیسر شمیم کی زبان میں شہد کا ذائقہ محسوس کرنے والی صلاحیت کم ہونے لگی۔ اور زبان کو شہد اس لئے میٹھا لگنے لگا کہ اس کا مزا میٹھا ہوتا ہی ہے۔ چاہے وہ غذا کی صورت میں ہو یا دوا کی صورت میں۔ مسز شمیم کی گرمجوشی اتنی تیزی سے کم ہوئی کہ پروفیسر کی سمجھ میں آسانی سے آگیا کہ یہ شادی، شادی کی غرض سے نہیں بلکہ کسی اور غرض سے کی گئی تھی۔ پھر اس نے مسز شمیم کو دل کھول کر غرض پوری کرنے کا موقع دیا۔ زندگی کے ہر عیش و عشرت کو اس پر ارزاں کر دیا۔ مگر وہ خود عیش و عشرت کی سرگرمیوں سے دور اپنے ریسرچ میں کھویا رہتا۔ ہنی مون سے واپسی کے بعد شاطر کی آمد و رفت بہت بڑھ گئی اور وہ زیادہ سے زیادہ وقت پروفیسر کی کوٹھی میں گزارنے لگا۔ اس نے شاطر اور مسز شمیم کو کافی سہولت دیدی۔

کیوں کہ وہ چاہتا تھا کہ مسز شمیم اس کا کم سے کم وقت لے۔

مسز شمیم اپنے سیدھے سادے شوہر کی دولت سے کھیلنے لگی اس کے لیے تو اس نے سارا ڈھونگ رچایا تھا۔ پروفیسر کو اپنی دولت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اتنی دولت لے کر کرتا بھی کیا۔ ایک تنہا ذات کے لیے چاہیئے ہی کیا وہ دنیا میں تن تنہا رہ گیا تھا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر اس نے ایک کالج میں پروفیسری کر لی تھی۔ مگر یہ سلسلہ دو تین سال سے زیادہ نہ چل سکا ——— اور اس نے مستعفی ہو کر گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی۔

چند مخصوص احباب تھے جن کا آنا جانا رہنے لگا۔ پانچ نوکر تھے۔ مالی، چوکیدار بھنگی، باورچی اور گھریلو خادم۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ پروفیسر شمیم نے یہ نوکر چاکر بھی اس لئے رکھ چھوڑے تھے کہ کوٹھی میں بھوت پریت نہ بسیرا کر لیں۔ صرف ایک نوکر پرانا تھا جو پروفیسر شمیم کو باپ سے ورثے میں ملا تھا۔ یعنی کریم میاں جو اس کی ذاتی خدمات پر مامور تھا۔

اسی کریم میاں کی زبانی بعض دوستوں کو پروفیسر شمیم کے خاندانی حالات کا علم ہو سکا تھا۔ پروفیسر شمیم کے باپ کی ایک چھوٹی سی جاگیر تھی۔ یہ جاگیرداری کئی پشتوں سے چلی آئی تھی۔ جاگیردار صاحب بڑے نیک نام تھے۔ صرف ایک معمولی سی بدنامی ان کے ساتھ لگی ہوئی تھی کہ بیوی کے ہوتے ہوئے ایک عورت رکھ لی تھی۔ خیر یہ تو رئیسوں کا ایک شوق ہے۔

رئیسوں کا ہمیشہ سے ایک دستور چلا آتا ہے کہ محبت تو بیوی سے کرتے ہیں مگر دلچسپی بیوی کی رقیبوں سے رکھتے ہیں۔ یہ انوکھا دستور تاریخ کے

ہر دور میں رئیسوں کو زیب دیتا ہے۔

پروفیسر شمیم کے باپ نے بھی روایت قائم رکھی، بلکہ انہوں نے تو نکاح پڑھوا کر حرام کو حلال کر لیا تھا اور اس کو شہر میں باقاعدہ ایک مکان دے رکھا تھا۔ اس عورت کا نام مہتاب تھا۔ چڑھتی جوانی ہی میں جاگیردار صاحب کی نظر عنایت اس پر ہوئی تھی۔ مہتاب بڑے تہذیب بالاخانے کی تربیت یافتہ تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ جاگیردار صاحب نے پہلی رسم بھی شرعی نکاح کے بعد ہی ادا کی تھی، اس مہتاب بیگم کے بطن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام شہناز رکھا گیا۔

شہناز پیدا ہوئی تو پروفیسر شمیم کی عمر آٹھ سال کی رہی ہو گی جاگیردار صاحب کو گھریلو بیوی سے صرف ایک اولاد ہوئی تھی شمیم۔ نہ اس سے پہلے نہ اس کے بعد۔ دوسری اولاد شہناز تھی جس کا جاگیردار صاحب کے گھر خاندان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

پھر ۱۹۴۷ء میں جب شہناز پانچ چھ سال کی تھی تو ملک آزاد ہو گیا۔ فسادات اور ہنگامے ہوئے۔ افراتفری اور بھگدڑ پڑ گئی اسی فضا میں مہتاب ایک دن دہشت زدہ ہو کر بستر پر ایسی گری کہ دل کی حرکت جواب دے گئی محلے کے ایک مشہور غنڈے نے موقعہ سے فائدہ اٹھایا۔ مہتاب کی لاش کو بے گور و کفن چھوڑ شہناز کو مع زیورات و نقدی اغوا کر کے پاکستان لے بھاگا اس کے بعد مہتاب کی موت اور شہناز کی زندگی کے بارے میں طرح طرح کی باتیں مشہور ہو گئیں۔ جاگیردار صاحب اس غم میں بیمار

سے رہنے لگے۔ پھر ۱۹۵۲ء میں ایک اور جھٹکا لگا کہ جاگیرداری جاتی رہی۔ اور جس دن شمیم کے ایم اے پاس کرنے کی خبر آئی۔ اسی دن وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

کچھ ہی دنوں بعد جب ماں نے بھی دنیا سے منہ موڑ لیا تو شمیم کو اکیلے پن کا احساس ہوا۔ اور شہناز کا خیال آیا جس کو اس نے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔ اس نے ایک بار انڈیا اور پاکستان کے اخبارات میں 'تلاش گمشدہ' کا اشتہار بھی دیا۔ مگر اپنا نام پوشیدہ رکھ کر۔ مگر شہناز کہاں ملنے والی تھی۔ اس کو تو غنڈے نے لاہور لے جا کر فروخت کر دیا تھا۔ اور شہناز پاکستان سے بھی ایکسپورٹ ہو چکی تھی۔ یہ اشتہار اس غنڈے کی نظر سے بھی گزرا۔ اس نے ایک گمنام خط میں پروفیسر شمیم کو صرف اتنا لکھا کہ "تمہاری بہن شہناز زندہ ہے۔ وہ کبھی نہ کبھی تم سے ضرور ملے گی" غنڈے نے یہ ظالمانہ شرارت صرف اس لئے کی تھی کہ کہیں شہناز کو وہ مردہ سمجھ کر بھول نہ جائے۔ وہ شہناز کے ان دیکھے بھائی کو ذہنی اذیت میں مبتلا رکھنا چاہتا تھا۔

کچھ عرصہ بعد وہ غنڈا ہندوستان واپس آگیا۔ اور وہاں سے وہ رقم لانے میں کامیاب ہو گیا جو بدنصیب شہناز کو اغوا کرنے اور فروخت کرنے میں ہاتھ لگی تھی۔ ان دنوں شمیم لیکچرر بن کر پروفیسر شمیم کے نام سے مشہور ہو چکا تھا یہ غنڈا کچھ تعلیم یافتہ تھا۔ مگر تعلیم سے کہیں زیادہ اس کی سوجھ بوجھ تھی۔ اس نے انڈیا واپس آکر بظاہر مہذب شہری کی زندگی شروع کی۔ پروفیسر شمیم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات رکھنے لگا۔ ہندوستان آکر

غنڈے کی رسم و راہ فلم والوں سے پیدا ہو گئی۔ اور اس نے بھی ایک فلم بنانا شروع کر دیا۔ یہ دھندا اس نے اس لئے پسند کیا کہ اس کے ذوق کے مطابق اس میں آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام تھے۔

مگر غنڈے کا سرمایہ ختم ہو گیا۔ اور فلم ادھوری رہ گئی۔ اس نئی لڑکی کی حسرت بھی ادھوری رہ گئی جو اپنی پہلی ہی فلم کے ذریعے راتوں رات مشہور ہیروئن بن جانے کا خواب دیکھا کرتی تھی۔ اس کو اپنے خواب کی تعبیر اسکرین کی بجائے بستر پہ ملی۔ اس نے اس تعبیر سے بھی سمجھوتہ کر لیا۔ وہ ایسے ہی چند بستروں سے ہوتی یہاں تک پہنچی تھی۔ اب ان دونوں کو ہر قیمت پر ایک ایسے فنانسر کی تلاش تھی جو آنکھ کا اندھا اور گانٹھ کا پورا ہو۔ اس غنڈے تے اپنی ہیروئن کو کمند بنا کر اِدھر اُدھر پھینکا تو سہی، مگر نشانہ خطا کر گیا

ایک دن اس ہیروئن نے غنڈے کے پاس ایک تصویر دیکھی۔ یہ تصویر ایک مرد، ایک عورت اور ایک بچی کی تھی۔ یعنی جاگیردار صاحب، مہتاب بائی اور شہناز کی۔ اسی دن وہ اخبار بھی نظر سے گزرا جس میں ”آواگون“ پر ایک مضمون اور اس کے ریسرچ کے سلسلہ میں پروفیسر شمیم کا فوٹو چھپا تھا۔

وہ غنڈا شاطر تھا اور وہ ہیروئن مس شمیم۔

اور اب پروفیسر شمیم کو گرفت میں لے کر یہ دونوں اس کی نفسیات سے کھیل رہے تھے۔

ایک دن شاطر اچانک کہیں چلا گیا۔

مسز شمیم اُداس اداس رہنے لگی۔ وہ اکثر پروفیسر شمیم کے سامنے گھنٹوں

افسردہ اور خاموش بیٹھی رہتی۔ پروفیسر کو اس پر ترس آنے لگا۔

ایک دن پروفیسر نے بڑے خلوص سے کہا ـــــ "کیا ہوا جو شاطر چلا گیا۔ دولت تو ہے۔ دنیا میں خوشیوں کا میلہ لگا ہوا ہے۔ میں ان خوشیوں کا خریدار نہیں۔ مگر تم کیوں اپنے آپ کو محروم کرتی ہو؟ دولت خوشیاں ہی خریدنے کے لیے ہوتی ہے۔ میری خوشی اسی میں ہے کہ ہماری دولت کا ایک ایک پیسہ خوشیوں کی خریداری پر صرف ہو جائے۔ اتنی خوشیاں اکٹھی کر لو کہ مرتے دم تک ختم نہ ہو سکیں۔"

پروفیسر شمیم کے اس ڈائیلاگ پر مسز شمیم رو پڑی۔

پروفیسر کی تسلیوں پر وہ بڑی غمناک آواز میں کہنے لگی ـــــ "میں آج تمہیں ایک ایسی خوشی کا پیغام دینا چاہتی ہوں جو دولت کی نہیں بلکہ محبت کی دین ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس کی پلکیں جھک گئیں اور بڑی دھیمی آواز میں بولی "میں ماں بننے والی ہوں۔"

پروفیسر کے جسم میں لہر سی دوڑ گئی۔ اور وہ مسکرا کر کسی خیال میں کھو گیا۔ یہ اس کی زندگی کی پہلی سچی خوشی تھی ـــــ ایک ننھی سی خوشی، جسے اس کے دل نے محسوس کیا۔

اس خوش خبری کے ایک ہفتہ بعد ایک دن شام کو پروفیسر مسکراتا ہوا خواب گاہ میں داخل ہوا۔ مسز شمیم کسی گہری سوچ میں پڑی تھی۔ پروفیسر نے کچھ کاغذات اس کو تھماتے ہوئے کہا "یہ اپنی جائیداد وغیرہ کے کاغذات ہیں ان میں میرے وصیت نامے کی ایک نقل بھی ہے میرے بعد سوا تمہارے کوئی اور

پر بھی اسے کتنی راحت اور کتنے سکون کا احساس ہو رہا تھا! ایک سرے سے دوسرے سرے تک دکانیں بند تھیں۔ اس لیے سڑک اور فٹ پاتھ کی چوڑائی معمول سے دگنی نظر آنے لگی تھی۔ کہیں کہیں بڑی دکانوں پر مسلح سنتری کھڑے دکھائی دیتے تھے۔ اونچی کوٹھیوں کے خوبصورت اور ہوادار فلیٹوں کے دریچے کھلے تھے اور پردے سمٹے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں کھڑکیوں میں ہلکی ہلکی سبز اور نیلی روشنی یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے نیند کے خمار اور ہوا کی خنکی سے بوجھل ہو رہی ہو۔ اس اونگھتی ہوئی مدھم مدھم روشنی کا تصور اپنے اندر کتنی حلاوت اور رومانیت رکھتا ہے۔ یہ دھندلی اور خیال انگیز روشنی —— —— کمرے کی عروسانہ سجاوٹ، سرخ دیواریں۔ نیلی کھڑکیوں کے گلابی پردے۔ ایک طرف قدآدم آئینہ اور دوسری طرف صاف اور ملائم بستر —— بستر پر کھلے ہوئے گیسوؤں کی چھاؤں اور گیسوؤں کی آوارہ اور بھینی بھینی خوشبوؤں سے مہکی ہوئی سانسیں۔ سانس کی آمد و شد سے پیدا ہونے والے زیر و بم۔ جیسے خاموش ندی کی سطح پر چھٹکی ہوئی چاندنی میں ابھرتی اور مٹتی ہوئی لہریں۔ گیسوؤں کے ہالے میں ایک چمکتا ہوا چہرہ جو صالح خون کی فراوانی سے سرخ تازہ سیب نظر آ رہا ہو۔ آنکھیں جیسے سرسبز کنول کی کٹوریاں ہوں اور ہونٹ جیسے گلاب کی شاداب پنکھڑیاں۔

کتنا حسین اور مہکا ہوا تصور! صابر کی بھوک کہیں سو گئی اور قدموں میں پھرتی آ گئی۔ خیالات میں سرشاری سی پیدا ہونے لگی۔ جس ماحول کا تصور اپنے اندر اتنی حرارت رکھتا ہو اس کی حقیقت کتنی زندگی بخش اور دل کش ہو گی جو کچھ

صابر کے لئے محض ایک تصور تھا وہ نیلی کھڑکیوں کے گلابی پردوں کے پیچھے کسی کے لئے حقیقت بھی ہوگی ۔ جو صابر کا خواب تھا ۔ وہ کسی خوش نصیب کی تعبیر بھی تو ہو سکتی تھی ۔

اور تصور کے سہارے وہ اپنے محلہ میں پہنچ گیا ۔ اس محلہ میں صابر کو پانچ سال گزر چکے تھے اس کا ہر گوشہ اس کی ہر چیز اور اس کی ہر بات اس کی جانی پہچانی تھی ۔ وہ اس محلہ کے کتوں کو بھی پہچانتا تھا ۔ لیکن اس کا دل کبھی نہیں لگا ۔ کیونکہ وہ اس جگہ کو اپنی زندگی کی رعنائیوں اور رنگینیوں کا مدفن سمجھتا تھا اس کی حالت بالکل مور جیسی تھی ، جو اپنے بال و پر کی رنگینی اور دل آویزی کو دیکھ کر مست ہو جاتا ہے اور ناچنے لگتا ہے اور ناچتے ہی ناچتے جب اس کی نظر اپنی مکروہ اور بد ہیئت ٹانگوں پر پڑتی ہے تو اس کی امنگوں اور مستیوں پر اوس پڑ جاتی ہے ۔ اس کے بال و پر شرم و تحقیر کے احساس سے لاجونتی کی طرح سہم کر سمٹ جاتے ہیں ۔ اس محلہ میں پہنچ کر صابر کی بالکل یہی کیفیت ہوتی تھی ۔ وہ اپنے اندر ناچتی اور گنگناتی ہوئی زندگی کے جلوے بھر کر لاتا اور اپنے مکان کی کھڑکی پر نظر پڑتے ہی جلوے ذہن و خیال سے کافور ہو جاتے ۔

آج بھی اس کی نظر جب اپنے کمرے کی کھڑکی پر پڑی تو اسے بوسیدہ پردے کے پیچھے لالٹین کی مری ہوئی زرد زرد روشنی جھلکتی دکھائی دی ۔ لالٹین کی اس ہلکی اور میلی روشنی میں کتنی پژمردگی اور سوگواری تھی ۔ جیسے اس روشنی میں زندگی کا نوحہ پڑھا جاتا ہو ۔ جہاں ہر لمحہ زندگی پر ماندگی ، خستگی کے احساس سے مریضانہ غنودگی طاری رہتی ہو ۔ اس کوٹھری میں جہاں صابر کے

دکھوں اور غموں کی کہانیاں چھپی ہوئی تھیں وہیں اس کی چھوٹی چھوٹی نادار خوشیاں بھی مسکرایا کرتی تھیں اور انہی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کی مسکراہٹوں کے سہارے وہ زندہ تھا۔ اگر یہ چند مسکراہٹیں بھی نہ ہوتیں تو شاید وہ خودکشی کر لیتا یا یوں ہی گھلتے گھلتے اس کی موت ہو جاتی۔

کمرے کی چوکھٹ پر پہنچ کر اس نے دستک دی۔ اس کی کہانیوں کی ہیروئن ——— روشن بے خبر سو رہی تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس نے صابر کا انتظار نہیں کیا تھا بلکہ وہ انتظار کرتے کرتے ہی سو گئی تھی۔ روشن محض ایک عورت ——— ایک بیوی تھی۔ ایک رہتی سہتی عورت جو ہندوستانی عورتوں میں نہیں پائی جاتی۔ البتہ حقیقی زندگی کے اسٹیج اور اسکرین پر اکثر و بیشتر مسکراتی رہتی ہے۔ اگر روشن کوئی فلمی عورت ہوتی تو سامنے کھانا رکھ کر بیٹھ جاتی اور" درد بھری "لے میں کوئی" "بہاریہ" گیت گا رہی ہوتی اور گیت ختم کر کے شوہر کے دکھ اور اپنی غمگین محبت کا رونا بڑے ہی ڈرامائی انداز میں در و دیوار کے سامنے رو رہی ہوتی۔ لیکن روشن تو انسانی خاصیت رکھنے والی زندہ عورت تھی۔ اس لئے اسے نیند آ گئی تھی۔ متواتر دو تین بار دستک دینے پر اس کی آنکھ کھلی تو اس نے بستر پر لیٹے لیٹے ہی کہا "دروازہ کھلا ہوا ہے ——— آ جائیے"۔

صابر نے کمرے میں داخل ہوتے ہی لالٹین کی لو تیز کر دی۔ کمرے کی ہر چیز پر حسرت کی ایک نظر ڈال کر وہ کپڑے بدلنے لگا۔ اس نے راستہ چلتے ہوئے تصورات کی دنیا میں زندگی کا جو "تاج محل" تعمیر کیا تھا۔ وہ ایک

پل میں مسمار ہو گیا۔ ایک شہر کی دو حقیقتیں ـــــ دونوں ایک دوسرے سے کس قدر متضاد! ایک وہ حقیقت جو کہیں نیلی کھڑکیوں کے گلابی پردوں کے پیچھے مخمل اور ریشم کی سیج پر سانس لے رہی ہوگی اور دوسری وہ حقیقت جو صابر کے سامنے ملگجے بستر پر دھڑک رہی تھی۔ روشن منجان مرنج اور وفا شعار بیوی تھی۔ جس کی آنکھوں میں گھٹن سی پیدا ہو گئی تھی۔ جتنے ارمانوں اور ولولوں نے سسک سسک کر اس کے اندر دم توڑے تھے اور جتنی حسرتیں اور تمنائیں کچلی گئی تھیں ان سب کے نقوش اس کے تیکھے خدوخال میں ثبت ہو گئے تھے۔ اس وقت بھی وہ بہت ہی اداس اداس سی نظروں سے صابر کو دیکھ رہی تھی۔ یوں تو وہ اکثر متفکر ہی رہا کرتی تھی۔ کیونکہ ایک سو دس روپے کو مہینے کے تیس دنوں میں تقسیم کر دینے کے بعد روزمرہ زندگی میں خوشیوں کا دور دور تک سراغ نہیں ملتا تھا۔ لیکن اتنی دیر تو وہ ہشاش بشاش ضرور نظر آتی جتنی دیر وہ صابر کے ساتھ تنہا ہوتی۔ اس کی باتوں میں کچھ شوخی بھی پیدا ہو جاتی اور بند ہونٹوں میں دبی دبی سی مسکراہٹیں بھی آنکھ مچولی کھیلتی رہتیں۔

صبح دس بجے صابر گھر سے کھانا کھا کر گیا تھا اور اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ آج تو دفتر جاتے وقت روشن اس کی جیب میں حسب معمول چار آنے بھی نہ ڈال سکی تھی۔ گھر کے بجٹ میں صابر کے لئے چار آنے روز جیب خرچ مقرر تھا۔ لیکن آج مہینے کی ۳۱ تاریخ تھی اور بجٹ ۳۰ ہی روز کی کفایت کر سکتا تھا۔ اس لئے اسے یقین تھا کہ روشن بھولی نہیں تھی۔ اس کے حسین خیالوں اور سنہرے سپنوں کا اندراسن تو گھر میں قدم رکھتے ہی درہم

برہم ہو چکا تھا۔ اس لئے بھوک نے پھر ستانا شروع کیا۔ کپڑے بدل چکا تو اس نے بہت ہی عجلت کے لہجہ میں روشن سے کہا "لاؤ کھانا لاؤ!"

لیکن اس کی توقع کے خلاف روشن نے بستر سے اٹھنے کی بجائے لیٹے لیٹے ہی کہا ـــ "طاق پر رکھا ہے لے کر کھا لیجئے۔ میرا ذرا سر بھاری ہو رہا ہے۔"

صابر کو ذرا مذاق کی سوجھ گئی تو اس نے برجستہ کہا ـــ "خدا رکھے سر بھاری ہونے پر یہ نخرے ہیں تو پاؤں بھاری ہونے پر نہ جانے کیا قیامت توڑے گی۔"

روشن کو اس وقت مذاق کا موڈ نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے بُرا نہیں مانا۔ بلکہ صرف اتنا ہوا کہ اس کی نگاہیں حیا سے جھک گئیں۔ اس کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر صابر پھر بولا ـــ "بھئی ہم تو ایسے نہیں کھائیں گے۔ قسم خدا کی وہ کھانا ہی کیا جو روشن کے ہاتھوں سے نہ کھایا گیا ہو۔"

اس بار تو روشن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ ہی گئی۔ لیکن وہ مسکراہٹ چھلاوے کی مانند معاً ناپید ہو گئی۔ صابر کی ایسی باتوں سے وہ نہال ہو جاتی تھی اور یہی تو وہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں تھیں جو صابر کی زندگی کا سہارا بنی ہوئی تھیں لیکن اس وقت وہ کچھ بے چین ہو گیا۔ کیونکہ اس نے روشن کو اتنی سرد اور اتنی پژمردہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آخر اس کے لبوں کی مسکراہٹ چھلاوے کی طرح چھلک کر ناپید کیوں ہو گئی! اور وہ اس کی طرف چوری چوری کیوں دیکھ رہی تھی؟ ـــ صابر ذرا سنجیدہ ہو گیا۔ روشن نے بات کو بھانپ لیا اور اس کے ذہن کو اِدھر اُدھر بھٹکنے سے روکنے کے لئے بولی "سچ کہتی ہوں

میرا جی اچھا نہیں ہے۔ بستر سے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا ذرا تکلیف کر لیجئے۔"

لیکن صابر نے اصرار کیا "قسم خدا کی میں آپ کا سر اس وقت تک دباتا رہوں گا جب تک آپ کو نیند نہ آجائے ــــ آپ اٹھئے تو سہی۔"

اور اب روشن کے لئے کوئی چارہ نہیں تھا اس لئے وہ اٹھ بیٹھی۔

صابر کے آگے کھانا رکھتے ہوئے وہ بولی ــــ "آج اماں کو بازار جانے میں بہت دیر ہوگئی تھی نہ سبزی ملی نہ اور کچھ ملا۔ آج شکر سے روٹی کھا لیجئے کہئے تو چائے بھی بنا دوں۔"

ایک منٹ کے لئے صابر پر سکتہ طاری ہوگیا۔ اب اس کی سمجھ میں آگیا کہ روشن اسے کھانا دینے میں اتنی کیوں ہچکچائی تھی "بیوقوف!" اس نے دل ہی دل میں کہا ــــ "کہتی ہے کہ بازار جانے میں دیر ہوگئی تھی۔ یوں نہیں کہتی کہ گھر میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ اگر اس نے دفتر جاتے وقت چونّی دی ہوتی تو خیر یقین آ بھی جاتا کہ چلو ایسا ہو سکتا ہے لیکن یہ بہانہ سازی کیوں؟ وہ کوئی مہمان تو نہیں ــــ"

صابر کے پے در پے چوٹ کھائے ہوئے ذہن کو آج پھر جھٹکا سا لگا، اور بہت ہی اذیت اثر احساس برچھی کی انی کی طرح اس کے دل میں اتر گیا اس نے ایسے جھٹکوں کو سہارنا سیکھ لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ روشن کے ڈھکے چھپے جذبات میں پژمردگی پیدا ہو اس نے فوراً ہی سنبھال لیا اور ہنس کر بولا۔

"قسم خدا کی، آخر اس میں تکلف ہی کیا تھا۔ ایک دن یوں ہی سہی۔ اور اور آپ کے ہاتھوں سے تو زہر بھی مل جائے تو قسم خدا کی اس کا مزا شربت

سے کم نہ ہوگا۔"

روشن نے گلاس میں پانی ڈالتے ہوئے بڑی ادا سے چڑ کر کہا "چلیے ہٹیے، بہت باتیں بنانے لگے ہیں آپ۔ میرے منہ میں خاک۔ کچھ دیکھ تو نہیں پایا ہے کہیں ــــــ؟"

صابر نے پہلا ہی نوالہ پانی کے ساتھ نگلتے ہوئے روشن کے سر کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا "قسم خدا کی، قسم لے لیجیے مجھ سے۔ ایسا بدذوق واقع ہوا ہوں کہ آپ کے سوا کوئی نظر میں جچتی ہی نہیں، قسم خدا کی۔"

روشن کھکھلا کر ہنس پڑی، دونوں کے ذہن سے غبار جھڑ گیا۔ بدلیاں چھٹ گئیں اور بہار آ گئی۔

صابر نے روٹی اور شکر کا ایک لقمہ بنا کر روشن کے منہ میں زبردستی ٹھونستے ہوئے کہا "قسم خدا کی کھا کر تو دیکھیے کہ کیسا مزا آ رہا ہے۔"

"آج بڑے ادب اور قاعدے میں بات ہو رہی ہے۔ خیریت تو ہے؟"

روشن نے لقمہ چباتے ہوئے پانی کا گھونٹ لیا "یہ آپ، تو کچھ میری ہی زبان کو زیب دیتا ہے۔"

"قسم خدا کی ــــــ"

روشن نے جھٹ بات کاٹ دی "آپ پہلے کھانا کھا لیجیے، اور خدا کی قسم تو مفت کی چیز ہے بعد میں جتنا جی چاہے کھا لیجیے گا۔" صابر ہنسنے لگا اور روشن کہتی رہی۔ "میں سوچتی ہوں آپ کھانا زیادہ کھاتے ہیں یا خدا کی قسم زیادہ کھاتے ہیں۔ آخر حشر میں اس کے لیے بھی پرسش تو ہو گی ہی۔"

"لیکن آپ جیسا وکیل بھی تو میرے ساتھ ہوگا۔" صابر نے ہنس کر جواب دیا۔

روشن چائے بنانے کے لئے اسٹوو جلانے چلی گئی۔ بغل والے کمرے میں صابر کے والدین سو رہے تھے جن کی وہ پہلی اور آخری اولاد تھا اس کا باپ قبل از وقت بوڑھا ہو کر کمزور ہو چکا تھا اور ماں دمہ کے عارضہ کا شکار تھی۔ اکلوتے بیٹے کو دونوں نے بڑے لاڈ اور چاؤ سے پال پوس کر پروان چڑھایا تھا۔ اور جہاں تک بن پڑا پڑھا لکھا بھی دیا تھا۔ نوکری لگ گئی تو اس کا گھر بھی بسا دیا اور دلہن بھی ایسی لادی جو سیرت میں لاکھوں میں ایک ہو۔ اور صورت بھی کیا بری تھی۔ بہت اچھی صورت والی عورتیں تو گھرہستی کا کم اور بناؤ سنگار کا زیادہ خیال رکھتی ہیں۔ صابر کو تو ایسی بیوی کی ضرورت تھی جو گھر گرہستی کو دکھ سکھ کے ساتھ چلا سکے۔ سو اس کے والدین نے بڑی چھان بین کر کے ویسی ہی لڑکی ڈھونڈھ نکالی، ماشاءاللہ وہ پڑھی لکھی بھی تھی۔ غریب لڑکوں کو اچھی پڑھی لکھی لڑکیوں کے ماں باپ آنکھ نہیں لگاتے لیکن صابر قسمت کا ایسا دھنی نکلا کہ جتنا پڑھا لکھا وہ خود تھا، اتنی ہی پڑھی لکھی بیوی بھی مل گئی اور روشن بھی صابر کو کہاں مل سکتی تھی اگر اس کے ساتھ ایک جھوٹی بدنامی نہ لگی ہوتی۔ البتہ ایک فکر صابر کی ماں کو کھائے جا رہی تھی۔ شادی کو پانچ سال گزر چکے تھے لیکن روشن اور صابر کی زندگی کی کوئی کونپل نہیں پھوٹی تھی۔ اس کی ماں سوچا کرتی کہ جوانی کے دن ہیں، اگر ایسے میں گود ہری نہ ہوئی اور گھر میں بہار نہ آئی تو آگے چل کر کیا خاک امید ہوگی۔ روشن کی گود ہری دیکھنے کے لئے

حقدار نہ ہوگا۔ اب تم تنہا نہیں ہو۔ اگر میں تم سے پہلے مرگیا میری لاش کے علاوہ ہر چیز تمہاری ہوگی۔ میں نے اپنی لاش کا عطیہ میڈیکل کالج کو دے دیا ہے۔"

مسز شمیم طیش میں آکر اٹھ بیٹھی۔ کاغذات کو اس طرح پھینکا کہ وہ منتشر ہوگئے۔ اور بپھر کر بولی ـــــ "تم نے یا تو مجھے پتھر سمجھ لیا ہے یا بازاری عورت یہ کیا ڈھونگ ہے۔ کیا میری قیمت یہی ہے۔ دولت ـــــ جائداد؟ میں ان سب پر تھوکتی ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے وہ کاغذات کی طرف اس طرح لپکی جیسے انہیں چاک کر ڈالے گی۔ مگر پروفیسر نے بڑھ کے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "یہ میں نے اس بچے کے لئے کیا ہے جس کی تم ماں بننے والی ہو۔ میرے باپ نے بھی جیتے جی سب کچھ میرے نام کردیا تھا۔"

مسز شمیم نے پلنگ پر اوندھے منہ گر کر سسکنا شروع کیا۔ پروفیسر نے کاغذات کو یکجا کر کے اس کے تکیے کے نیچے رکھ دیا اور باہر نکل گیا۔ ابھی وہ دوسرے کمرے میں پہنچا ہی تھا کہ خواب گاہ کے کمرے کا دروازہ زور سے بند کرنے کی آواز آئی۔ پروفیسر سمجھ گیا کہ معاملہ کیا ہے۔ مسز شمیم نے دو تین روز پہلے جو بات کہی تھی وہ اس کے کان میں گونجی ـــــ "میں تمہارے لئے اپنے دل میں محبت تو پاتی ہوں۔ مگر میرے قدم تمہاری خواب گاہ کی طرف اٹھتے جھجکتے ہیں۔ میں شروع ہی سے کچھ ایسا محسوس کرتی رہی ہوں۔ تمہارے جسم سے مجھے تازہ خون کی بو آتی ہے۔ یہی میری اداسیوں کا راز ہے۔"

پھر وہ قیامت کی گھڑی آگئی۔ جس کا وقت کو انتظار تھا۔

ایک دن مسز شمیم جب ڈرائنگ روم میں نہیں پہونچی تو پروفیسر خود اس کے کمرے میں گیا۔ اور مسز شمیم کو ایسے حال میں پایا کر ڈر گیا۔ بال پریشاں، لباس بے ترتیب، آنکھوں میں وحشت، چہرہ ویران اور ہونٹ خشک، جیسے پاگل پن کا سکتہ طاری ہوگیا ہو۔ اس کے ہاتھ میں ایک پرانا فوٹو تھا۔ بستر کے نیچے ایک لفافہ اور لفافہ کے قریب ایک خط پڑا تھا۔ پروفیسر نے سوچا کر یقیناً کہیں سے کوئی وحشت ناک خبر آگئی ہے۔ اس نے خط اٹھا کر پڑھنا شروع کیا۔

"شہناز ـــ ہاں یہی تمہارا نام ہے۔ اب شمیم کا خول اتار دو اور جگر تھام کے سن لو کر اس خط کے ساتھ جو تصویر بھیج رہا ہوں اس میں ایک جاگیردار کلیم اللہ خاں اور دوسری مہتاب بائی ہے۔ اور تیسری تم ہو ـــ یعنی شہناز انتقام کی وہ آگ جو ستائیس برس تک میرے سینے میں بھڑکتی رہی ہے آج ٹھنڈی ہوگئی۔ تمہاری ماں مہتاب بائی میری محبوبہ تھی۔ لیکن تمہارے باپ نے دولت کے زور سے میری محبت کا خون کر دیا جس کا بدلہ میں نے اس کی عزت کے خون سے لیا۔ میں نے زیورات اور نقدی کے لالچ سے نہیں بلکہ کلیم اللہ خاں کی عزت سے کھیلنے کے لئے تمہارا اغوا کیا تھا۔ اس کی عزت سے ہولی کھیل کر انتقام تو میں نے لے لیا۔ اب مجھے اپنی خاموشی کی قیمت چاہیئے۔ پورے ایک لاکھ! اس سے آگے تم دونوں جانو۔"

اس خط کو پڑھتے ہوئے پروفیسر کے دماغ میں دھماکہ سا ہوا۔ مگر وہ جی کڑا کر کے سنبھلا مسز شمیم کے ہاتھ سے تصویر لے کر دیکھی۔ مہتاب اور شہناز کو تو اس نے دیکھا نہیں تھا کیسے پہچان سکتا۔ مگر باپ کی تصویر صحیح تھی تصویر

کی پشت پر ایک شعر لکھ کر اس کے باپ نے دستخط کیے تھے۔ یہ تحریر بالکل اس کے باپ کی تھی۔

پروفیسر کو وہ گمنام خط یاد آیا "تمہاری بہن شہناز زندہ ہے اور کبھی نہ کبھی تم سے ضرور ملے گی۔" اور مسز شمیم کے وہ الفاظ "میرے قدم تمہاری خواب گاہ کی طرف اٹھتے جھجکتے ہیں۔ تمہارے جسم سے مجھے تازہ خون کی بو آتی ہے۔"

پروفیسر باؤلوں کی طرح مسز شمیم کا منہ تکنے لگا۔ مسز شمیم کے ہونٹ کپکپائے اور وہ پوری قوت سے "بھیا" کی چیخ مار کر اس سے لپٹ گئی اور دھاڑیں مار کر رو پڑی پھر منہ اور بال نوچ کر دیوار سے ٹکرانے لگی۔ پروفیسر کو محسوس ہوا کہ مکان کی چھت گر گئی ہے اور وہ اس کے نیچے دب گیا ہے۔ زبان بولنے سے اور دماغ نے سوچنے سے انکار کر دیا۔ وہ منہ لٹکائے بھاری قدموں سے باہر نکل گیا۔ تو مسز شمیم نے دوڑ کر اس کے ہاتھ سے خط لفافہ، اور فوٹو چھین لیا۔ اور پروفیسر کی جیب سے ماچس نکال کر ان تینوں کو آگ لگا دی۔ اور اس آگ سے اپنے کپڑوں کو آگ لگانے کی کوشش کی تو پروفیسر نے روک لیا۔

"نہیں تم نہیں۔" پروفیسر مری ہوئی آواز میں بڑبڑایا۔

مسز شمیم نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے زیر لب کہا—— "نہیں ہم دونوں۔"

اور اسی دن مسز شمیم بغیر کچھ کہے سنے پراسرار طور پر کہیں چلی گئی۔ نہ جانے مسز شمیم کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت محسوس ہوئی۔

دوسری صبح پروفیسر کو بستر پر مردہ پایا گیا۔ پولیس نے بند دروازہ توڑ کر

جب لاش پر قبضہ کیا تو اس کو دو تین سطروں کی ایک تحریر ملی جن میں پروفیسر نے خودکشی کا اقرار کرتے ہوئے ہر کسی کو شک و شبہ کی زد میں آنے سے بچایا تھا لوگوں نے سمجھا کہ دیوانے نے آواگون کے چکر میں پڑ کر جان دی ہو گی۔ مگر سب کو حیرت تھی کہ مسز شمیم کہاں چلی گئی۔ نوکروں نے صرف اتنا کہا کہ وہ تو صاحب کو بتا کر کہیں گئی ہو گی۔ نوکروں کو کیا معلوم۔

تیسری صبح مسز شمیم نے دھڑکتے ہوئے دل اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے خلاف معمول اخبار کو الٹ پلٹ کر دیکھا تو اس میں پروفیسر شمیم کی خودکشی کی خبر واقعی موجود تھی۔ اور خودکشی سے پہلے مسز شمیم کے گھر سے پراسرار طور پر کہیں چلے جانے کی طرف اشارہ بھی۔

وہ اسی وقت اسٹیشن پہنچی تھی۔ عقل کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے وہ کسی سے ملے بغیر دوسری ٹرین سے گھر لوٹ پڑی۔ اور گھر پہنچ کر اس نے اپنے ماتم کا وہ رنگ جمایا کہ دیکھنے والوں کے دل ہل گئے۔ غرض ایک ہفتہ کے اندر اندر پروفیسر کی خودکشی کی بات رفع دفع ہو گئی۔

ابھی پروفیسر شمیم کا کفن بھی میلا نہ ہوا تھا کہ شاطر بمبئی سے مسز شمیم کے پاس پہنچ گیا اس وقت وہ تنہا بیٹھی شراب سے غم غلط کر رہی تھی۔ شاطر نے چھوٹتے ہی مسز شمیم کے اس مبارک غم کی تعزیت کرتے ہوئے اس کی اداکارانہ صلاحیتوں کی داد دی۔

مسز شمیم نے اس کو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا پھر ایک جام بھر کر اس کی طرف بڑھایا۔ جام لیتے ہوئے شاطر نے پوچھا "باہر ایک بڑے میاں ہیں اور

ایک بڑی بی بھی ؟"

مسز شمیم کے لبوں کو جنبش ہوئی " وہ میرے والدین ہیں۔"

شاطر نے اس کو کچھ سرد سرد محسوس کیا۔ حالانکہ وہ ہزاروں خواہشوں اور امیدوں کا ہجوم لئے آیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ مسز شمیم اس کو دیکھتے ہی ناچ اٹھے گی۔ مگر وہ تو اپنی کرسی پر ہلی تک نہیں۔ شاطر نے اس کے موڈ کو جگانے کے لئے جام ہاتھ میں اٹھا کر پوچھا۔

"کس کے نام پر ؟"

"پروفیسر کے اس ہونے والے بچے کے نام جس کے وجود کی کوئی حقیقت نہیں ؟"

دونوں غٹاغٹ جام چڑھا گئے اور قبل ازیں کہ شاطر کوئی بات چھیڑے مسز شمیم نے بڑے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "شاطر صاحب! مجھے افسوس ہے۔ پولیس کو اس آدمی کی تلاش ہے جس کا خط پروفیسر شمیم کی خودکشی کا سبب بنا۔"

شاطر نے گھبرا کر کہا "پولیس کو خط کا علم کیسے ہوا۔ وہ تو تم نے جلا دیا ہوگا؟"

مسز شمیم نے شاطر کے لئے دوسرا جام انڈیلتے ہوئے بتایا " جلا تو دیا ہوتا مگر دل نے کہا کہ یہ ایک کانٹا بھی کیوں رہے۔ میں نے قانون کی مدد کرنے کے لئے وہ خط پولیس کے حوالے کر دیا۔ پولیس کو انتظار ہے کہ خط لکھنے والا اس کوٹھی میں ضرور آئے گا۔ ہر گھنٹہ پولیس کا فون آتا رہتا ہے۔" شاطر کے چہرے

کا رنگ اڑ گیا اور وہ کرسی پر کسمسانے لگا۔

باہر کسی نے کال بیل بجائی جیسے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی ہو۔ شاطر کے ہاتھ سے جام جھوٹ گیا اور وہ ہڑبڑا کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ مسز شمیم کے قہقہے کوٹھی کے دروازے تک اس کا تعاقب کرتے رہے۔

۳۱ مارچ

کئی روز کی شدید گرمی کے بعد موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ اور آج تو بادل اس طرح ٹوٹ کر برسا تھا جیسے اس نے کئی مہینوں کا بخار ایک ہی دن میں نکال لیا ہو۔ شہر کی سڑکیں اور گلیاں دھل کر صاف ستھری ہو گئی تھیں۔ شام کو دو گھنٹے تک بارش ہوتی رہی اور رات کو چاندنی چھٹک گئی۔ آسمان صاف تھا اور دھلی ہوئی چاندنی میں ہلکی ہلکی خنکی رچی ہوئی تھی۔ موسم بہت ہی سہانا اور خوشگوار تھا۔ لیکن صابر کی زندگی موسم کے قید و بند سے آزاد تھی۔ اس کی زندگی میں ہر طرف خزاں ہی خزاں تھی۔ اس کی زندگی ایک ریگستان تھی جس میں کوئی سبزہ اگا ہی نہیں اور اگر کبھی بارش کی کوئی بوند پڑی بھی تو ریگستان کی پیاسی چھاتی نے اسے جذب کر لیا۔ اس کی زندگی ریگستان تھی پھر بھی کبھی کبھی بادل کا ایک آدھ آوارہ ٹکڑا بھٹکتا اور منڈلاتا ہوا آنکلتا اور چند لمحوں کے لئے ایک سرکتا ہوا سایہ ڈال کر یا چند بوندیں برسا کر اس کے تپتے ہوئے کلیجے کو کسی قدر ٹھنڈا کر دیتا۔

رات کے ساڑھے گیارہ بجے صابر دفتر سے واپس آ رہا تھا۔ جس روز کام زیادہ اور ضروری رہتا صابر کے لئے وقت کا تعین نہیں ہوتا۔ اس کے آرام سے کام بہر حال زیادہ ضروری تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا، اس سے۔ جس طرح بھی بن پڑتا کام نبٹا کر ہی گھر واپس آتا۔ اگر ایسا نہ کرتا تو پھر نوکری جاتی رہتی۔ ایک سو دس روپے ماہوار دے کر اس کا دفتر دو سو بیس روپے کا کام لیا کرتا تھا۔ یہ بھی دفتر کا احسان ہی تھا کیونکہ اس سے کم تنخواہ پر اس سے بھی زیادہ کام کرنے والے امیدواروں کی ایک لمبی فہرست دفتر میں موجود تھی لیکن صابر پانچ سال سے محنت اور دیانتداری کے ساتھ کام کر رہا تھا اس لئے دفتر کو یہ گوارا نہ تھا کہ اسے ہٹا کر کوئی دوسرا آدمی رکھا جائے۔ آخر یہ احسان نہیں تو اور کیا تھا۔

سڑکوں پر سناٹا اور در و دیوار پر سکوت طاری تھا۔ جیسے کائنات اونگھ رہی ہو۔ صابر کے تھکے ہوئے بوجھل قدم تیز چلنے میں کہیں کہیں لڑکھڑا جاتے تھے اسے بھوک بھی بہت تیز لگ گئی تھی۔ ایک میل کی مسافت کا نصف طے کرنے کے بعد ٹھنڈی ہوا چلنے کے باوجود پسینہ پسینہ ہو گیا۔ ایک لیمپ پوسٹ کے پاس کھڑے ہو کر اس نے بیڑی سلگائی۔ گلی میں سے پولیس کا ایک پہریدار نکل آیا۔ اس نے صابر کو ٹوکا کہ وہ کون ہے اور اتنی رات گئے کہاں چکر کاٹ رہا ہے؟ تسلی بخش جواب پا کر وہ چلا گیا۔

شہر کے سب سے زیادہ خوش حال اور فیشن ایبل علاقہ میں پہنچتے پہنچتے صاب تھک کر چور ہو گیا۔ اور اس کا جی چاہا کہ اسی سڑک کے چوڑے اور ٹھنڈے فٹ پاتھ پر لیٹ جائے ———— اس فٹ پاتھ

اس کی ساس کو بڑی جلدی تھی۔ کبھی وہ سوچتی کہ لڑکے نے کہیں بہو کو کچھ کھلا نہ دیا ہو اور کبھی اسے خیال گزرتا کہیں بہو نصیبوں جلی کی گود خالی ہی نہ رہ جائے۔ کبھی کبھی تو ساس کی رازدارانہ سرگوشیوں سے روشن چڑ جاتی اور کوفت کے مارے اس کے پاس سے اٹھ کر اِدھر اُدھر ٹل جاتی۔

صابر نے اپنی ازدواجی زندگی کے اس پہلو کی طرف نہ کبھی دھیان دیا تھا اور نہ اسے اس کی تمنا تھی۔ ایک آدھ بار دبی دبی زبان سے روشن نے بھی اپنی حسرت کا اظہار کیا تھا لیکن صابر نے اسے کوئی اہمیت نہ دی تھی کیونکہ وہ تو یہ سوچتا تھا کہ اپنی ہی زندگی دو بھر ہو تو بچے لے کر کوئی کیا کرے گا۔ وہ تو بس روشن سے عشق کرتا تھا اور بیوی سے عشق کرنا کچھ کھیل نہیں ہے ـــ اور وہ بھی مسلسل پانچ سال تک۔ اور اس طرح کہ شیشے میں کبھی بال نہ آیا ہو۔ پانچ سال تک کسی اکتاہٹ اور بیزاری کے بغیر تو کالج کی کسی لڑکی کے ساتھ بھی کوئی عشق نہیں کر سکتا جو نہ کپڑا مانگتی ہے نہ کھانا خرچ مانگتی ہے اور نہ گھر مانگتی ہے بلکہ عشق اور صرف عشق مانگتی ہے۔

کھانا کھا چکا تو صابر برآمدے میں کلی کرنے کو نکلا۔ اس کی آہٹ پا کر ماں بھی کھانستی ہوئی باہر آ گئی۔ ماں کی زبان سے یہ سن کر کہ آج راشن اور پیسہ دونوں ختم تھا صابر کو نہ تعجب ہوا اور نہ کوئی دکھ ہوا کیونکہ آج وہ دفتر سے تنخواہ لے کر آیا تھا۔ لیکن یہ سن کر اس کا دل زہر کے پیالے میں ڈوب گیا کہ روشن نے رات کا کھانا اس لئے نہیں کھایا تھا کہ روٹی نہیں تھی۔

صابر کھچا کھچا سا اپنے بستر پر آ کر بیٹھ گیا۔ روشن اسے اتنا خاموش اور افسردہ

دیکھ کر سہم اٹھی اور فوراً ہی تاڑ گئی پہلے اسے کوئی ملال نہیں تھا لیکن اب یہ دکھ اس کو اندر ہی اندر دبوچ رہا تھا کہ جس بات کو اس نے راز میں رکھنا چاہا وہ صابر کو معلوم ہوگئی ——— اور وہ بھی عین وقت پر۔ اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ چائے کی پیالی لے کر صابر کے قریب جائے۔ کچھ دیر پہلے اس کمرے میں جو بہار آئی تھی وہ لوٹ گئی۔ چھٹی ہوئی بدلیاں پھر گھر آئیں اور جھڑا ہوا غبار پھر جم گیا۔ کمرے پر وہی سکوت اور سناٹا چھا گیا جو صابر باہر سڑکوں پر دیکھ کر آیا تھا۔ لیکن اندر ہی اندر اس سناٹے میں نہ جانے کتنے ہنگامے جاگ رہے تھے اور اس سکوت میں کتنے طوفان گونج رہے تھے۔

آخر روشن ہمت کر کے اٹھی اور چائے کی پیالی لے کر صابر کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ صابر اس کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لینے کی بجائے اس کے چہرے کو دیکھنے لگا ——— آنکھیں نڈھال اور گھائل، ہونٹ سمٹے ہوئے، چہرے پر ایک رنگ آتا اور ایک جاتا ہوا۔ محبت، خفت اور ایک نامعلوم خوف سے ہونٹ لرزاں اور پلکیں بوجھل۔ لیکن صابر کو روشن کی اس رحم طلب اور رقت خیز کیفیت پر ترس نہیں آیا بلکہ طیش آیا۔ اسے اپنا دل اتنا بوجھل محسوس ہو رہا تھا جیسے روشن زمین پر نہیں اس کی چھاتی پر کھڑی تھی۔ اور صرف ایک منٹ کے اندر وہ یوں محسوس کرنے لگا کہ اس کی چھاتی پھٹ جائے گی اور دماغ شق ہو جائے گا۔ ایک عجیب اضطراری اور بے اختیار کیفیت اس پر طاری ہوئی اور ایک بھرپور طمانچہ روشن کے گال پر جا پڑا۔ روشن ایک طرف اور چائے کی پیالی دوسری طرف۔

——— اور جب بادل کھل کر برس چکا تو مطلع صاف ہو گیا۔ اور صابر کے دل کا بوجھ اتر گیا ——— روشن کا نیلا رخسار اس کے زانو پر تھا۔ اس کے ہونٹوں پر سہمی ہی مسکراہٹ تھی اور صابر کی آنکھوں میں ڈھلکے ڈھلکے سے آنسو ——— کتنی عجیب بات!

* * *

ایک شام

یہ کلکتہ کی مشہور و معروف چورنگی ہے۔ دسمبر کی پندرہ تاریخ ہے آج سردی معمول سے زیادہ ہے شام کے چھ بجے ہیں۔ چہل پہل اور گہما گہمی میں ہر لمحہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ زمین پر روشنی کی جگمگاہٹ اتنی تیز ہے کہ آسمان کی تاریکی کی طرف نظر اٹھانے کا خیال تک نہیں آتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شہر کی ساری رونق اور ساری زندگی چورنگی میں سمٹ آئی ہے۔

میں شاہی مسجد کے پچھلے کونے پر ریلنگ کا سہارا لئے کھڑا ہوں۔ میرا ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں ہے اور دوسرا ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال کر شارع عام پر بے مدعا کھڑا رہنا نفسیاتی نقطہ نظر سے معیوب ہے۔ کیونکہ جو آدمی اس طرح اور ایسی جگہ پر کھڑا پایا جائے۔ اس کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی جا سکتی یعنی کھڑے ہونے کا یہ انداز کم از کم کسی اچھے ارادے کا پتہ نہیں دیتا اور پھر کلکتہ کی چورنگی میں شام کے وقت اٹھائی گیرے کی طرح کھڑے رہنا تو اور بھی بری بات ہے۔

چورنگی سے شام کے وقت "شرفاء" گزرتے تو ہیں، لیکن اس طرح کھڑے نہیں ہوتے ہیں کسی ماہرِ نفسیات کے اس نقطۂ نظر کو جھٹلانا نہیں چاہتا ٹھیک ہی تو کہتا ہے وہ بھلا یہ بھی کوئی تک ہے کہ سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر خواہ مخواہ اِدھر اُدھر کبھی حیرت اور کبھی حسرت اور کبھی وحشت سے دیکھ رہے ہیں —— لیکن کم از کم میں تو ایسا ہی کر رہا ہوں آنے جانے والی صورتوں اور کاروں پر بے مقصد اور بے ارادہ نظریں ڈال رہا ہوں۔

آنے جانے والوں کے ہجوم میں کوئی "دیدہ ور چیز" بھی نظر آجاتی ہے اور میری نگاہیں دور تک اس کا تعاقب کرتی ہیں جب تک کہ وہ چیز راہ گیروں کے غول میں گم نہیں ہو جاتی ہر نگاہ ہر اچھی صورت کے چھلاوے پر جھپٹتی اور طبیعت مچل جاتی ہے —— بے کار —— فضول —— لیکن دل ہی تو ہے۔ کوئی اسے کیا کرے۔

آخر میں شہر کی سب سے بڑی جگمگاتی ہوئی شاہراہ پر کیوں کھڑا ہوں۔

"میں کیا چاہتا ہوں؟"

اندر ہی اندر میرا دم گھٹ رہا ہے۔ میرے اردگرد ایک دنیا سیلاب کی مانند گزر رہی ہے۔ پھر بھی میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہوں۔ یہاں کھڑے رہنے کو جی نہیں چاہتا۔ پھر بھی کھڑا ہوں اور نہ جانے کب تک اور کھڑا رہوں گا۔ کتنا عجیب اور پراسرار ہے یہ مشغلہ بھی!

میں جانتا ہوں کہ میں ابھی بہت دیر تک یونہی کھڑا رہوں گا —— یہ چورنگی مجموعی طور پر بہت دلچسپ جگہ ہے کیونکہ اس چوراہے پر ہمارے سماج کا بھانڈا

پھوٹ جاتا ہے۔ طبقاتی کش مکش اور عدم مساوات کے ایسے نمونے دیکھنے میں آتے ہیں کہ اگر ملک کا کوئی سیاسی دلال بھی ایک لمحہ کے لئے یہاں رک کر عقل اور احساس سے کام لے تو اس کی گردن شرم وغیرت سے جھک جائے گی —— تو کیا میں کھڑا ہو کر طبقاتی کش مکش کا جائزہ لے رہا ہوں؟ نہیں آخر میں یہاں کیوں کھڑا ہوں؟ کوئی شخص مجھے اس حالت میں دیکھ کر میرے بارے میں کیا رائے قائم کرے گا؟ ظاہر ہے کہ کسی شاہراہ کے کنارے اس طرح کھڑا ہونے والا کوئی جیب کترا بھی ہو سکتا ہے جو آنے جانے والوں کی جیبوں کو سونگھ رہا ہوں۔ یا کوئی سی آئی ڈی کا آدمی ہو سکتا ہے۔ جو اپنے شکار کو بھانپ رہا ہو۔ یا پھر کسی ”نئے“ اور ”تازہ مال“ کا دلال ہو سکتا ہے۔ جو لوگوں کی نظر سے ان کے دل کا حال معلوم کر رہا ہو۔ لیکن میں تو ان میں سے کوئی بھی نہیں۔ پھر کیا ہوں —— کیوں کھڑا ہوں؟؟ —— پاگل نہیں نہیں ابھی میں پاگل نہیں ہوا ہوں۔ ابھی زمانہ اتنا طاقت ور نہیں ہوا۔ کہ مجھے احساس وشعور سے بھی محروم کر دے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ میں کچھ نہ کچھ ضرور ہوں اور میرے اس طرح کھڑے رہنے کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہے اگر کچھ نہیں تو میرے بارے میں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ زندگی کی جن لذتوں کو میں چکھ نہیں سکتا، زندگی کے جس حسن کو میں چھو نہیں سکتا۔ اور جن مسکراہٹوں کو میں پا نہیں سکتا۔ انہیں حسرت ورشک سے دیکھ رہا ہوں۔ زندگی کی جن نعمتوں کو میری دسترس سے دور کیا گیا ہے۔ انہیں اپنے ارد گرد بکھری ہوئی دیکھ کر تسکین پانے کی کوشش کر رہا ہوں یا پھر یہ کہ زندگی کے اس چوراہے پر اپنی قنوطیت اور شکست خوردگی کا

اعلان کر رہا ہوں یا زندگی کی رنگینیوں اور مسکراہٹوں کو رقصاں دیکھ کر میرا نفس نفس "اے کاش ! اے کاش" پکار رہا ہے اور چاہتا ہوں کہ اپنے گرد بکھری ہوئی رنگینیوں اور مسکراہٹوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لوں ، ماحول کے حسن و جمال اور زندگی کے نقش و نگار سے اپنے ویرانے کو آباد کر لوں ۔ یہ خیال حقیقت سے بہت زیادہ قریب ہے لیکن حقیقت نہیں ہے ۔

مجھے سردی لگ رہی ہے ۔ ذرا ایک سگریٹ پی لوں ۔ جب میں سگریٹ کی پوری پیکٹ خریدتا ہوں اس دن چورنگی ضرور آتا ہوں ۔ نہ جانے یہ کیا بات ہے ۔ دراصل میں چورنگی کبھی کبھی آتا ہوں ۔ یعنی ایک خاص کیفیت ہے جو مجھے کشاں کشاں چورنگی کی طرف لے آتی ہے اس کیفیت کا احساس تو بہت واضح اور شدید ہے لیکن اس کی لفظی تشریح نہیں کی جا سکتی ۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا کہ اس کیفیت کا شکار ہونے کے بعد میرے اندر جذبۂ فرار پیدا ہو جاتا ہے اور میں بھیانک حقائق سے آنکھیں چرا کر اپنے آپ کو کہیں گم کر دینا چاہتا ہوں شیشے کے اندر سنسناتے ہوئے سمندر میں یا پھر ڈسپوزل کے مال کی خریداری میں ڈسپوزل کا یہ مال دراصل خریدا نہیں جاتا ۔ کرائے پر ملتا ہے یہ کھلے بازار اور چور بازار دونوں میں ملتا ہے ۔ ڈسپوزل کا یہ اسٹاک کبھی ختم نہیں ہوتا ۔ ہمیشہ بڑھتا ہی رہتا ہے ۔ ڈسپوزل کا یہ مال بالاخانوں بدبودار کوٹھریوں اور شراب خانوں کے علاوہ کھلی سڑکوں پر بھی مل جاتا ہے ۔

دراصل یہ سماج کی قے ہے جسے ہر رات ہزاروں بلکہ لاکھوں آدمی ذوق و شوق سے پیتے ہیں ۔ اور پھر قے کر دیتے ہیں اور اس قے کو میں بھی کبھی کبھی زہر

مار کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں۔ زندگی سے فرار اور حقیقت سے گریز کرنے کی کوئی نہ کوئی راہ تو گاہے گاہے نکالنی ہی پڑتی ہے۔ ورنہ جس تاریک اور زہریلی فضا میں زندگی کو قید کر دیا گیا ہے وہ زیادہ دیر تک انسان کو زندہ نہیں رہنے دے گی اور جب انسان ہی مر جائے گا تو پھر زندگی کی قدروں کو بقا کیسے ملے گی —— اور جب اس قے کی ہوئی جنس کو بھی اپنے لئے ارزاں نہیں پاتا ہوں تو اس چورنگی میں اپنے آپ کو گم کر دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

یعنی میں چاہتا ہوں کہ میرے ارد گرد اتنے جگمگاتے ہوئے جلوے اتنے ہنگامے ہوں۔ کہ میں اپنے آپ کو نہ دیکھ سکوں۔

ایک سگریٹ ختم ہو چکی ہے اور اب میں دوسری سگریٹ سلگاؤں گا۔ میری زندگی بھی سگریٹ کی طرح جل رہی ہے۔ لیکن زندگی کو جو آگ جلا رہی ہے اس میں دھواں نہیں ہے۔

اس آگ نے جذبات میں سوز پیدا کر رکھا ہے جذبات کے دیرینہ سوز نے زندگی کو نڈھال کر دیا ہے اور جب کبھی یہ نڈھال زندگی چلتے چلتے تھک جاتی ہے تو ذرا دیر سستانے کے لئے گھنی چھاؤں کا سہارا ڈھونڈنے لگتی ہے اور اس گھنی چھاؤں میں میری بھٹکتی ہوئی روح ایک پرسوز راگ الاپنے لگتی ہے —— گھائل روح کے گھائل گیت میں اس منزل کی شہادت ہوتی ہے جہاں پہنچ کر احساس اور جذبات کے گہرے زخموں پر پھاہا پڑ جاتا ہے لیکن وہ منزل جوں جوں قریب آتی ہے سفر دشوار ہوتا جاتا ہے۔

گویا میں زندگی کا تھکا ہوا راہی ہوں اور یہ چورنگی ایک گھنی چھاؤں ہے

کسی گیسو کی چھاؤں نہیں۔ کسی لق و دق ریگستان کے تنہا درخت کی چھاؤں ہے میں اس کی چھاؤں سے تازہ دم ہو کر گھر لوٹتا ہوں تاکہ اپنے شانۂ زندگی کے جوا کو سہار سکوں۔

آج میں زندگی کے اس مینا بازار سے اپنے لئے کچھ نہ کچھ خرید کر نہیں تو چرا کر ہی ضرور لے جاؤں گا۔ کچھ نہیں تو ایک حقیقی مسکراہٹ ہی سہی۔ زہر خند کا تو میرے پاس خزانہ ہے۔ لیکن مسکراہٹوں سے میری دنیا خالی ہے۔ اگر میں مسکراہٹ خرید نہیں سکتا تو کم از کم کچھ دیر کے لئے مسکرا لوں۔ کس پر جھپٹوں۔۔۔۔ کس پر مچلوں؟ —— کس کو چھینوں کر چھوڑ دوں؟ یہاں تو مسکراہٹوں اصلی اور کھوئی ہوئی مسکراہٹوں کا میل جول بے پناہ ہے۔ کیسے چھانٹوں؟ کیسے جانچوں؟؟ اچھا اچھا —— نہیں نہیں یہ نہیں —— وہ سہی —— نہیں —— وہ بھی نہیں۔ اور صحیح —— میرا اشارہ اس غنچہ دہن یاسمین بدن، نازنین کی طرف نہیں جو سڑک پار کر کے ابر کی طرح کہیں سے لچک رہی ہے اور کہیں سے ابھر رہی ہے اور جس طرح ننگی پنڈلیوں اور نیم برہنہ چھاتیوں پر نگاہ کی یورش ہو رہی ہے۔ بقول شخصے یہ مال ڈسپوزل کا نہیں ہے۔ کلکتہ میں اگر عورت ٹکے سیر بکتی ہے تو ایسی عورتوں کی بھی کمی نہیں جو اشرفیوں میں تلتی ہیں۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں جس عورت کو دیکھ رہا ہوں وہ فروختنی نہیں ہے۔ لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ کباڑ خانوں میں نیلام نہیں کی جاتی آئینہ خانوں میں سجائی جاتی ہے وہ عورت گزر چکی ہے۔ لیکن اس کی پرچھائیں اب تک میری نظروں میں سمائی ہوئی ہے اور ابھی کتنی عورتیں آمنے سامنے گزر رہی ہیں لیکن ایسی کوئی نہیں جو اس پرچھائیں پر اپنی پرچھائیں

ثبت کر سکے۔

ایک عورت آ رہی ہے۔ کیا کہنے ہیں اس کے! اس نے اپنی نسائیت کی ادنیٰ ترین کشش کو بھی اتنا نکھارا اور ابھارا ہے کہ غور سے دیکھنے والوں کا دم نکل جائے — قربان جایئے۔ کیا انداز پایا ہے کیا چال پائی ہے۔ جس زاویئے سے دیکھئے جان لیوا ہونے کی حد تک دل کش ہے اس عورت نے اپنی ساخت کو اس قدر سدھایا ہے اور اپنے جلوے کو اتنا اچھال دیا ہے کہ وہ عورت کی بجائے ایک خطرہ بن گئی ہے۔ اہلِ دل اور اہل نظر کے لئے خطرہ، اہل ثروت کے لئے ایک تماشہ اور اس مرد کے لئے مصیبت جس نے اس طرح اسے اپنے بازو کے گھیرے میں لے رکھا ہے جیسے وہ اس عورت کا خاوند نہیں۔ اس کے حسن وجمال کا سنتری ہے جیسے شہد کے چھتے پر ڈنگ مارنے والی مکھیوں کا پہرہ ہو — ٹھیک ہی تو ہے۔ یہ عورت چھتہ ہے اور اس کی جوانی شہد ہے۔ چھتے کو ہاتھ لگا نہیں کہ شہد ٹپک پڑے گا۔"

اپنی عورت کو نظر بد سے بچانے والے مرد پر مجھے بہت ترس آ رہا ہے۔ اس بچارے کی حالت دیکھنے میں اس فقیر جیسی معلوم ہوتی ہے جسے راہ چلتے بیش بہا موتیوں کی مالا مل گئی ہو۔ اور وہ اس مالا کو اپنی گدڑی میں چھپائے ہوئے پھرتا ہو۔ جسے ہر لمحہ یہ فکر ستاتی ہو۔ کہ کوئی دیکھ نہ لے کوئی چھین نہ لے — بالکل اسی طرح یہ مرد اپنی "حور" کی فکر میں پریشان ہے۔ اس کی نظر حور پر نہیں بلکہ ان نظروں پر ہے جو اس کی بے پناہ دل کشی پر جھپٹ رہی تھیں اس "فقیر" کو یہ فکر کھائے جا رہی ہے کہ کہیں اس کی موتیوں کی مالا کوئی چھین کر نہ لے بھاگے۔ ایک ہوشیار سنتری کی طرح اس کی نظر خزانے پر نہیں بلکہ خزانہ تک پہونچنے کے

راستے پر ہے۔

ارے یہ کون ــــ؟ نہیں نہیں یہ وہ نہیں۔ میں بھی کہوں کہ بھلا لاہور کا فتنہ کلکتہ پہونچ گیا! یہ تو کوئی نازوں کی پلی پھول کی چھڑی ہے۔ نظر لگنے سے میلی اور چھو دینے سے پانی، چال ایسی جیسے بتاشوں پر چل رہی ہے حسن کو سترہ پردوں میں اس طرح چھپایا ہے جس طرح لوگ عیب کو چھپاتے ہیں۔ دراصل یہ بیچاری عورت نہیں "بہو بیٹی" ہے۔

بہو بننا کچھ بچوں کا کھیل نہیں اس کے لئے بڑی روحانی اور جسمانی ریاضت کرنی پڑتی ہے عورت کا "بہو بیٹی" بننا گویا سونے کا کندن بننا ہے۔ جب عورت قدیم اور فرسودہ روایات کے مطابق "بہو بیٹی" بن جاتی ہے۔ تو وہ بڑی سعادت مند اور نہ جانے کیا کیا کہلاتی ہے۔ اس کی نسائی دلکشی کو جتنی پھپھوندی لگے۔ اور اس کے ذہن پر زنگ کی تہیں چڑھیں اس کی سماجی قدر اتنی ہی بڑھتی جائے گی یعنی سونا کندن بنتا جائے گا۔ اس کے بعد اس منڈھی ہوئی "بہو بیٹی" کو لفافہ میں بند کر کے جیب میں رکھ لیجئے۔ فریم میں جکڑ کر طاق میں سجا دیجئے وہ ہرگز چون و چرا نہیں کرے گی نہ روئے گی نہ چیخے گی نہ ہنسے گی نہ گائے گی "بہو بیٹی" کے لئے اندھی گونگی بہری اور مفلوج ہونا ضروری ہے جب تک سانس لینے کے علاوہ باقی تمام باتیں مردہ جیسی نہ ہوں کوئی بہو بیٹی سعادت مند نہیں سمجھی جا سکتی۔ عورت ٹرافک کی ریل پیل سے گھبرا رہی ہے۔ اسکے ساتھ جو مرد ہے۔ وہ کسی کو بھی مشکوک نظر سے نہیں دیکھ رہا ہے۔ شاید اسے اس بات پر بھی فخر ہوگا کہ اس کے ساتھ چلنے والی عورت پیدا ہونے کے بعد نئے سر سے

ایسے سانچے میں ڈھال دی گئی ہے کہ اس کی طرف کوئی بری نظر سے دیکھ ہی نہیں سکتا۔ اس کا خیال بالکل صحیح ہے کیونکہ لوگ ہمیشہ اچھی ہی چیز کو بری نظر سے دیکھا کرتے ہیں اور بری چیز کو (اگر وہ عورت ہے) اچھی نظر سے دیکھتے ہیں۔ بہو بیٹی ڈھالنے کے کارخانے کو چلانے والے لوگ واقعی بڑے دور اندیش ہیں۔"

وہ عورت جا چکی ہے مگر اس کے لئے میرے دل میں جو درد پیدا ہوا تھا وہ ابھی نہیں گیا ہے ـــــ وہ بھی چلا جائے گا۔ ایک عورت ادھر سے جاتے ہوئے درد دے گئی ہے دوسری اُدھر سے آتے ہوئے اس درد کو لے جائیگی آخر وہ آ ہی گئی لیکن وہ جوں جوں قریب آتی جا رہی ہے میری نظر ہچکچا کیوں رہی ہے؟ سمجھ گیا! میری نظروں کو بجلی کی چکاچوند نے دھوکا دیا تھا۔ یہ عورت نظروں کو اٹھانے والی نہیں جھکانے والی ہے۔ اب یہ نسائیت کی اس بلندی پر پہونچ چکی ہے کہ اس کے چہرے پر پڑنے والی ہر نظر اس کے قدموں پر گر جائے گی۔ وہ ایک ماں ہے جس کی آغوش نے کئی ننھے اور نازک پودوں کو سینچ کر تناور درخت بنایا ہوگا۔ عورت کا یہ روپ بھی کتنا دل کش ہوتا ہے۔ اس کے مکھڑے میں کتنی ممتا ہے اور اس کے پروقار ہاتھوں میں کتنی شفقت ہے۔ کتنی ٹھنڈی اور پرسکون نظر آتی ہے وہ۔ بالکل جاڑے کی چاندنی رات کی طرح اس ٹھنڈک اور سکون کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اس کا باطن بے داغ ہے۔ اس کی زندگی کے ماضی اور حال میں کہیں کوئی شکن نہیں ہے۔ اس کے صحت مند چہرے پر جلال اور جمال کا جو امتزاج ہے وہ بتاتا ہے کہ جب چمن زار میں وہ شگوفہ سے کلی کلی سے پھول بن کر مرجھائی

وہ ہمیشہ شاداب رہا ہے جی چاہتا ہے کہ مامتا اور وقار سے بھرپور اس ماں کی گود میں سر رکھ کر سو جاؤں۔ لیکن وہ تو چلی بھی گئی۔ نہ جانے کیوں سینے میں ایک ہوک سی اٹھنے لگی ہے۔ اب میں تیسری سگریٹ سلگانا چاہتا ہوں۔

اچھا یہ ایک اور آئی۔ اچھی چیز ہے۔ لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ اس کی طرف میرے سوا شاید کوئی اور نہیں دیکھ رہا ہے، لیکن وہ خود میرے علاوہ ہر طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی ہے اس کا رک رک کر چلنا، بار بار پیچھے مڑ کر دیکھنا اور آس پاس نظر دوڑانا بے خیالی اور بے پروائی کے انداز میں قدم اٹھانا یہ سب کچھ اتنا بتانے کے لیئے بہت کافی ہے کہ اسے کسی کی تلاش ہے یہ تمام علامتیں اس کی چلتی پھرتی دکان کے سائن بورڈ ہیں۔ اس کی ہر نظر راہگیروں سے پوچھ رہی ہے کیا مجھے خریدو گے؟" اس کی نظر اب تک مجھ پر نہیں پڑی ہے۔ حالانکہ اسے میری ہی تلاش ہے لیکن وہ چلتے چلتے اچانک ٹھٹھک کیوں گئی؟

سمجھا! کہیں اسے امید کی جھلک نظر آئی ہے کوئی صیاد اس کے دام میں آنے والا ہے۔ ہاں ہاں وہ اپنے صیاد کو پھانس رہی ہے لیکن وہ نوجوان تو محض ایک لمحہ اس کے پاس ٹھٹک کر بے معنی ہنسی ہنستا ہوا آگے بڑھ گیا۔ کیا اس کا داؤ خالی گیا؟ کتنی مختصر تھی وہ بات جو اس عورت اور راہگیر نوجوان کے درمیان ہوئی۔ جیسے کسی دکاندار نے اپنے کاؤنٹر پر لگا رکھا ہو "ایک بات ایک دام" تو کیا گاہک اور دکاندار کی پٹری نہیں بیٹھی؟ وہ بھی ریلنگ کا سہارا لیکر کھڑی ہو گئی... بارے ایک نظر تو دیکھ لیا ظالم نے مجھے۔ لیکن وہ فوراً چل کیوں

پڑی ؟

کوئی شکار... بات کچھ نہ کچھ ضرور ہے ذرا دیکھو کہاں جاتی ہے۔

سمجھ گیا وہ نوجوان اگلے موڑ پر اس کا منتظر ہے۔

دونوں پہلو بہ پہلو چل پڑے۔ جیسے دونوں ایک ہی ڈگر پر ایک ہی منزل کی طرف چلنے والے ہم سفر ہوں مبارک ہو اے میرے انجان ساتھی مبارک ہو۔ وہ کوفت مبارک ہو۔ جو تھوڑی دیر بعد تم دونوں کے چہرے سے آشکارا ہو گی۔ اور جب تم دونوں ایک دوسرے پر تھوکنے اور ایک دوسرے سے پیچھا چھڑانے کے لئے بےچین ہو گے۔ میں جانتا ہوں کہ مجھ سے کوئی راز چھپا ہوا نہیں ہے۔ لیکن کوئی اسے کیا کرے کہ واقف اسرار ہونے کے باوجود ہر نئے راز کو دیکھ کر نئی کرید پیدا ہو جاتی ہے۔

ارے اس بھولی بھالی شکل والے جلاد کا بسیرا یہاں ہے یہ چپکے چپکے کدھر سے نکل آئی ؟ مجھے چھپ جانا چاہیئے، اگر دیکھ پائے گی تو پیچھے پڑ جائے گی۔ باہر سے بھرپور اور اندر سے کھوکھلی یہ عورت میری جانی پہچانی ہے۔ میرا ایک دوست اس عورت کو جانتا ہے وہ آگے بڑھ گئی۔ اچھا ہوا بلکہ خیر گزری جو وہ مجھے نہ دیکھ سکی۔ اُف وہ کتنی ڈھٹائی سے چل رہی ہے۔ چل کیا رہی ہے۔ کمبخت منڈلا رہی ہے نہ جانے آج کس غریب کی شامت ہے دیکھنے کی اور بھی چیزیں ہیں مگر اپنی نظر کو کیا کروں۔ شاید چورنگی کی عورت ہی سب سے زیادہ دیدہ ور ہوتی ہے۔ نگاہوں کو اِدھر اُدھر جانے ہی نہیں دیتی وہ جو ایک عورت سامنے سے آ رہی ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ اس کی طرف نہ دیکھوں لیکن دیکھ رہا ہوں۔ عورت کیا ہے۔ جیسے شاعروں اور افسانہ نگاروں کی ہیروئن ہے۔ وہ ہیروئن جو لازمی طور پر خوبصورت، دل کش اور توبہ شکن ہوتی ہے۔ اور جس کے حسن و شباب کو زوال نہیں اور جو ہر عیب اور ہر نقص سے پاک ہوتی ہے چاہے اسے خلعت روزگار ہی لپیٹ کر رہگذر پر پھینک دیجئے۔ شاعر اور افسانہ نگار کے لئے اس کی توبہ شکنی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوگا اور اس کی ہر نظر سے مسجد مندر اور کلیسا کی دیواروں کو متزلزل کر دیا جائے گا۔

آج یہ پہلی عورت ہے جس نے گذرتے ہوئے مجھ پر نظر ڈالی ہے۔ اب شاید سارا راستہ وہ کسی مرد پر نظر ڈالنے کی ہمت نہ کر سکے گی کیونکہ اس نے مردانگی کے کارٹون کو دیکھ لیا ہے۔ اس کارٹون کا تصور دیر تک اس کی حوصلہ شکنی کرتا رہے گا۔ وہ کمبخت جانی پہچانی عورت چکر کاٹتی، منڈلاتی پھر پہونچ گئی۔ شاید آج کا بازار مندا ہے۔ کل اتوار تھا۔ اور آج سموار ہے تیزی کے بعد انحطاط لازمی ہوتا ہے ارے اس کی رفتار تیز ہو گئی؟ کیا اس نے مجھے دیکھ لیا؟ — اب کیا کروں؟ کہاں چھپوں؟؟ میں اس کے ساتھ جانا نہیں چاہتا۔ کیونکہ جب پچھلی دفعہ وہ مجھے یہاں سے لے گئی تھی۔ تو واپس آنے کے بعد میرا جی چاہتا تھا کہ خودکشی کر لوں۔ یہ عورت نہیں زندگی کا اگلا ہوا زہر ہے۔ اس کے پاس امرت کی ایک بوند بھی نہیں، یہ بے ایمان اور کنجوس کبھی نہیں لیکن جب اس کے پاس مٹھاس نہیں تو وہ کیا کرے۔ وہ تو خود مٹھاس کی متلاشی ہے، لیکن آج — آج تو میں اپنے زہر میں اس کے زہر کو ملا کر نہیں پی سکتا؟

میرے پاس صرف بیس روپے ہیں۔ مجھے جوتے خریدنے ہیں۔ مجھے ایک سوئٹر بھی چاہیئے یہ قمیض بھی مسکنے لگی ہے آج ہی ایک پتلون میں رفو کروایا ہے۔ ایک آڑے وقت میں کام آنے والے دوست کا قرضہ بھی چکانا ہے اور ابھی مہینے کے باقی پندرہ دن گذارنے ہیں کچھ دنوں سے نیند نہ آنے کی شکایت پیدا ہو گئی ہے جس کے لئے کوئی نہ کوئی دوا خریدنی پڑے گی۔ لیکن وہ عورت تو میرے سامنے مجسم سوال بن کر کھڑی ہو گئی اب اس نے میرا ایک ہاتھ بھی تھام لیا ہے میں اسے کیا جواب دوں؟ میں اسے کیسے سمجھاؤں؟ مجھ میں انکار کی جرأت نہیں اب میرا قدم خود بخود اس کے ساتھ اٹھ گیا۔

نفرت

آواز بڑی غمناک تھی۔

مگر رشید نے کوئی توجہ نہیں کی جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

انوری نے اپنے گھائل احساسات کے کرب کو دباتے ہوئے سہمی آواز میں پھر مخاطب کیا "آپ تو میری ہر بات کا برا مان جاتے ہیں۔ میں ہی بری ہوں تو میری باتیں کہاں اچھی ہوں گی پھر بھی فریاد تو کرنی ہی پڑتی ہے"

"تم ہمیشہ بکواس کیا کرتی ہو۔ میں کوئی بکواس سننا نہیں چاہتا"

رشید نے جھنجلا کر کہا "چپ چاپ سو جاؤ یا نہیں تو کمرے سے باہر نکل جاؤ۔

تم پر کوئی قیامت نہیں ٹوٹی ہے کہ فریاد کرو گی جیسی کرنی ویسی بھرنی"

"مگر میں تو آج تک نہ سمجھ سکی کہ میرا قصور کیا ہے"

"تم نے پھر بحث شروع کر دی میں کہتا ہوں چپ رہو۔" رشید بگڑ گیا انوری نے چپ سادھ لی۔

کچھ دیر کے بعد اس نے پھر ہمت کی آج ضبط کا یارا نہ تھا۔ اب تو آنکھوں میں آنسو بھی نہیں رہ گئے تھے کہ چپکے چپکے بہا کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی آج اس نے طے کر لیا تھا کہ اپنے احساس کی گرمی اور اپنے الفاظ کی تپش سے پتھر کو پگھلا کے رہے گی۔ رشید اس کا مالک، اس کا مجازی خدا۔ وہ دل کا برا نہ تھا۔ اس کا اسے یقین تھا مگر کچھ باتیں تھیں بے رحم ماحول اور ناگوار حالات کی باتیں جن سے متاثر ہو کر رشید نے بیگانگی کا رویہ اختیار کر رکھا تھا اس کی اور رشید کی شادی محبت اور رومان کی شادی تھی۔ خوشگوار تعلقات اور ہمدردانہ احساسات کی اس سے بڑی ضمانت اور کیا ہو سکتی تھی۔ مگر حالات انسان کو جو کچھ نہ بنا دیں وہ اپنے شوہر کی ذہنی کشمکش کو خوب سمجھتی تھی۔ یہی وہ کشمکش تھی جس کی وجہ سے رشید اس کے ساتھ انصاف نہیں کر پاتا تھا وہ انوری کے درد سے آگاہ تھا مگر اس کا اپنا بھی ایک درد تھا۔ انوری نے غم کے بوجھ سے کراہتی ہوئی آواز میں پھر اس کو لحاف میں سے مخاطب کیا "گر آج آپ نے میری فریاد نہ سنی تو شاید زندگی بھر کے لئے یہ زبان گونگی ہو جائے۔ آخر میں کس کو سناؤں۔ اپنے دل کے زخم کس کو دکھاؤں جب آپ بھی میرے نہیں تو میں کس کی ہوں۔ پھر میں کس کے لئے زندہ ہوں۔"

رشید نے اس بار کچھ نہ کہا۔

ذرا دیر خاموشی کے بعد انوری نے اپنے آپ پھر سکوت توڑا جیسے بہت سکون اور عافیت سے مرنے والا مریض اس طرح بول رہا ہو کہ جسم ساکت ہو اور صرف لب ہل رہے ہوں ”میں وہ دن بھولی نہیں ہوں جب میری ذرا سی اداسی پر آپ کے لیے پوری کائنات اداس ہو جایا کرتی تھی۔ جب آپ کہا کرتے تھے کہ میرے مسکرانے سے گلستان میں کلیاں کھل اٹھتی ہیں اور پھول بن جاتی ہیں۔ اور میری اداسی سے کھلے ہوئے پھول مرجھا جاتے ہیں۔ میں وہی ہوں آپ وہی ہیں مگر آج مجھ پر قیامت بھی گذر جاتی ہے تو آپ کو خبر نہیں ہوتی۔“

رشید چڑ کر بولا ”شاعری اور افسانے کی زبان میں باتیں نہ کرو۔ زندگی شاعری اور افسانہ نہیں ہے حقیقت ہے آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو۔ تمہارے یہ فلمی ڈائیلاگ مجھے اچھے نہیں لگتے روزمرہ کی زبان میں بات کرو میں اسی شاعری اور افسانے کی زبان اور انہیں فلمی مکالموں کا مارا ہوا ہوں۔ کاش وہ دن نہ آئے ہوتے تو آج یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔“

”محبت کر کے پچھتایا نہیں کرتے“

”محبت نہیں شادی کر کے پچھتایا کرتے ہیں، میں پوچھتا ہوں تم کہنا کیا چاہتی ہو۔ آخر تمہیں مجھ سے کیا شکایت ہے؟“

”میں آپ سے محبت مانگتی ہوں جس نے ہمیں رسوا کیا تھا۔“

”تو کیا تم سمجھتی ہو کہ یہ دونوں بچے نفرت کی پیداوار ہیں انوری تم تو اتنی پڑھی لکھی ہو اتنی ذہین ہو پھر ایک موٹی سی بات کیوں نہیں سمجھتی ہو۔

پہلے میں عاشق تھا اب میں شوہر ہوں۔ عاشق صرف عاشق ہوتا ہے مگر شوہر صرف شوہر نہیں ہوتا۔ وہ کسی کا بیٹا اور کسی کا بھائی بھی ہوتا ہے۔ شوہر پہ دنیا داری اور خانہ داری کی ذمہ داریاں ہوتی ہیں اور اس کی بیوی کو ان ذمہ داریوں کی تلخیاں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ دنیا کی کوئی عورت اگر وہ سماجی زندگی میں ہے تو ساری عمر محبوبہ بن کر نہیں رہ سکتی۔ خیر چھوڑو ان فضول باتوں کو۔ اگر تم کو ان شاعرانہ شکووں کے علاوہ کچھ اور نہیں کہنا ہو تو مجھے سو جانے دو۔ میں بہت ستایا ہوا ہوں میں نے زندگی میں بہت بڑا دھوکہ کھایا ہے جسے میں بھگت رہا ہوں۔ ساری زندگی بھگتوں گا۔“

انوری کا جی بھر آیا اور وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولی ”میں کب کہتی ہوں کہ آپ کی زندگی کی تلخیاں میری نہیں۔ مگر آپ اپنا غم مجھے بانٹنے کہاں دیتے ہیں۔ آپ تو میری ہستی کو اپنا سب سے بڑا غم سمجھے بیٹھے ہیں میں تو آپ سے انصاف مانگتی ہوں، میں تو آپ کا درد مانگتی ہوں۔ آپ میرے درد سے نا آشنا ہیں مگر میں تو آپ کا درد پہچانتی ہوں مگر یہ درد آپ نے خواہ مخواہ پیدا کر رکھا ہے۔ آپ کی زندگی کا وہی خود ساختہ درد میرا دشمن ہے میں چاہتی ہوں کہ آپ میرے درد کو اپنے سینے میں محسوس کر لیں تو آپ کا درد خود بخود جاتا رہے گا۔“

”کیا یہی تمہاری فریاد ہے میں شاعرانہ پہیلیاں نہیں سننا چاہتا۔ یہ سب بکواس ہے تم ہمیشہ ایسی ہی باتیں کیا کرتی ہو۔ میں تو تنگ آ گیا ہوں۔ تم ناول اور افسانے نہ پڑھا کرو۔ خدا کے لئے انوری میرے

حال پر رحم کرو۔ میں مر جاؤں گا تمہاری باتیں سن کر۔ تم جیتے میں میری مدد نہیں کر سکتی تو کم از کم خاموش رہ کر میرے مر مر کے جینے کا تماشہ تو دیکھ سکتی ہو۔ آخر تمہیں کیا شکوہ ہے۔ کیا میں تمہارے لئے وہ سب کچھ نہیں کرتا جو ایک شوہر کو اپنی بیوی کے لئے کرنا چاہیئے۔ اگر تمہیں دوسروں سے کوئی شکایت ہے تو میں کیا کروں، زندگی صرف بیوی سے تو نہیں ماں باپ، بھائی، بہن سب کو میں کیسے چھوڑ دوں۔“

” ماں باپ ہی پر کیا منحصر ہے آپ خود بھی تو پچھتاتے ہیں۔ آپ خود بھی تو کہتے ہیں کہ آپ نے دھوکا کھایا ہے۔“

رشید بستر پر اٹھ بیٹھا، ذرا تند لہجے میں بولا ” یہ تو حقیقت ہے اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ میری ساری امنگوں پر پانی پھر گیا ماں باپ کی ساری آرزوئیں مٹی میں مل گئیں۔ میری زندگی کیا ایسی ہی بے رونق اور تنگی کا شکار ہوتی۔ میں اتنا اچھا طالب علم تھا مگر بی اے بھی مشکل سے پاس کر سکا۔ والدین نے سوچا تھا کہ کسی طرح بی اے پاس کرا کے وہ کسی ایسے گھر میں میرا رشتہ کریں گے جو مجھے ولایت نہ بھیج سکے تو کم از کم ہندوستان ہی میں کوئی بھاری ڈگری دلا سکے۔ میرے استادوں کو مجھ سے کیا کیا امیدیں تھیں میں نے مستقبل کے کیا کیا خواب دیکھے تھے مگر ایک پھٹیچر اسکول ٹیچر بن کر رہ گیا ماں باپ کے طعنے سے زندگی کے کیا کیا صدمات نہ سہے۔“

” مگر اس میں میرا کیا قصور ہے۔“

تمہارا نہ بھی ہو، مگر تمہارے والدین کا تو قصور ہے۔ میرے والدین

ٹھیک ہی تو کہتے تھے۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ میں نے تم سے محبت کی اور تمہارے باپ نے میرے گلے میں باندھ دیا گویا دامن کی گرد جھاڑ لی۔ وہ اتنے امیر کبیر آدمی تھے چاہتے تو میرے لئے کیا کچھ نہ کر سکتے تھے۔ آخر ہم دونوں نے محبت ہی تو کی تھی۔ اس میں انتقام کی بات کیا تھی جو انہوں نے نکاح کے چھوارے پر ٹرخا دیا۔ اتنے بڑے افسر اتنے مہذب اور روشن خیال آدمی نے ہماری محبت کو اپنی دشمنی کی بنیاد بنا لی۔ میرا مستقبل تاریک ہو گیا اچھا انتقام لیا تمہارے باپ نے۔"

"میرے باپ نے تو صرف ایک بار انتقام لیا لیکن آپ کے والدین تو ساری زندگی انتقام لینے کی قسم کھائے بیٹھے ہیں آخر میرا کیا قصور ہے جو میں اٹھتے بیٹھتے طعنوں اور صلواتوں کا تختہ مشق بنتی ہوں۔ قصور تو میرے باپ کا بھی نہیں میری قسمت کا ہے۔"

"انوری! تم زندگی کی آخری سانس تک اپنے باپ کو بے قصور ثابت نہ کر سکو گی انہوں نے مجھ پر اور تم پر دونوں پر ظلم کیا ہے! آدمی کو اتنا تنگ دل نہ ہونا چاہیئے محبت کی خطا پر اتنی سنگین سزا کوئی جاہل اور گنوار بھی نہیں دے سکتا۔ میں کچھ ہیٹا تو نہ تھا وہ اپنی پسند سے بھی شادی کرتے تو آسمان سے تو کوئی لڑکا اترنے سے رہا۔ مجھ ہی جیسا کوئی دوسرا ہوتا پھر یہ چڑ اور عداوت کیسی؟"

"کیا عجب کہ ان کی اپنی نظر بھی آپ ہی پر جاتی مگر قسمت کو کیا کیجیے گا وہ جو ایک بات ہو گئی۔ نامراد بات۔ محبت تک بھی بات رہتی تو بات

بن جاتی مگر آپ ذرا آدمی کی نفسیات کو بھی سمجھیے۔ جہاں عزت اور غیرت کا سوال پیدا ہو جائے وہاں عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ کاش وہ حادثہ نہ ہوا ہوتا۔ اور ہم گویا ایک دوسرے کے گلے میں یوں بے دلی سے نہ باندھے جاتے۔"

"مگر اس میں قصور تمہارا ہی تھا۔ میں نے تو راز فاش نہ ہونے کا انتظام کر لیا تھا۔ تم ہی نے انکار کر دیا اور اپنی ماں پر سب کچھ ظاہر کر دیا۔ ورنہ اس وقت تک بگڑا ہی کیا تھا۔ کسی کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوتی۔"

"اگر میں نے آپ کی بات مان لی ہوتی تو آج یہ پھول سا نازک اور حسین بچہ جس کے ذرا رو دینے پر آپ کی جان نکلتی ہے کہاں سے آتا ہماری زندگی میں یہ محبت کا پھول کھلا تھا، زہر کا پودا نہیں تھا۔ پھول کی قدر کوئی مالی کے دل سے پوچھے۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ ہم نے محل کا خواب دیکھا تھا مگر جھونپڑے میں بسیرا لینا پڑا۔ میرا باپ مہربان ہو نہیں سکتا آپ سے میرا رشتہ ٹوٹ نہیں سکتا پھر زندگی کو تلخ کیوں بنائیں میرا جینا دوبھر کیوں ہو۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ کوئی دوسری ہوتی تو خودکشی کر چکی ہوتی۔ مگر آپ کی اور بچوں کی محبت میں پڑ کر زندگی سے ایسا پیار ہوا ہے کہ مر بھی نہیں سکتی اس حادثے کو پانچ سال ہونے کو آئے مگر آپ کی ماں کے طعنوں کا یہ عالم ہے جیسے کل کی یہ بات ہو۔"

"مگر ماں کو میں کیا کر دوں؟ اس کے ارمانوں کا خون ہوا ہے تو واویلا ضرور کرے گی میں نے تمہارے باپ کا ستم سہا تو تمہیں میری ماں کی باتیں

سنی ہی پڑیں گی۔ تم نہیں جانتیں کہ ماں نے میرے لئے کیا کیا خواب دیکھ رکھے تھے۔ تم نے سنا ہی ہوگا کہ اس نے چپکے چپکے کہاں رشتہ ٹھیک کر رکھا تھا۔ آج میں ولایت میں ہوتا۔"

"لیکن جب آپ نے مجھ سے محبت کی تھی اور جب آپ نے میرا اجلا دامن میلا کیا تھا تب آپ کے خوابوں میں میں ہی تھی اپنی ماں کے ارمانوں پر پانی پھیرنے کا قصور آپ سے ہوا ہے۔ میں نے ہی کون سا اپنے ماں باپ کا نام روشن کیا۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ قصور کریں آپ اور سزا میں بھگتوں۔ اب تو سزا بھگتنے کی تاب مجھ میں نہیں۔ میں نے آپ کو محبت دی۔ محبت کی دو نشانیاں دیں۔ اب جس خوفناک نفرت کا مجھے سامنا ہے اس کے مقابلے میں میں بہت کمزور ہوں۔ میں اپنے دامن میں پھول لے کر آئی تھی کانٹے سمیٹ کر چلی جاؤں گی۔"

"مجھے تو شعر اور افسانے از بر نہیں ہیں اس لئے میں تمہاری زبان میں جواب نہیں دے سکتا۔ نہ مجھے شاعری اور افسانے پڑھنے کی فرصت ہے کہ ڈرامائی باتیں کیا کروں۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ زندگی خوبصورت بھی ہے بھیانک بھی ہے آدمی میں ان دونوں روپ دیکھنے کی ہمت ہونی چاہیئے۔ ہاں اگر ان باتوں کو تم واپس جانے کا بہانہ بنانا چاہتی ہو تو میں تمہاری راہ میں کانٹے بچھانے کا حق نہیں رکھتا۔"

"میں اتنی بے شرم نہیں جو دروازہ مجھ پر بند ہوگیا میں اس پر دستک دینے کبھی نہیں جاؤں گی میں وہاں جاؤں گی جہاں سے واپسی ہی نہ ہو۔"

الوری کی اس بات پر رشید پر سکتہ طاری ہو گیا۔ رشید کو معلوم تھا کہ شادی کے بعد الوری نے کیا کیا ستم اور کیسے کیسے جذباتی کچوکے سہے تھے۔ ساس کو وہ کبھی پھوٹی نظر نہ بھائی تھی۔ ساس نے اس کو ہمیشہ نحوست کا سایہ سمجھا۔ الوری طبعاً بڑی لطیف اور نازک عورت تھی۔ بچپن ہی سے وہ پھول کے پودے کی طرح سینچی گئی تھی۔ اس کی پرورش ایک امیر گھرانے کے بے فکر شاعرانہ ماحول میں ہوئی تھی اس کو رنگینیانہ تفریحات سے کم اور علم ادب سے زیادہ شغف رہا تھا۔ رشید کا تعلق ایک ایسے گھرانے سے تھا جو بس دال روٹی سے خوش تھا۔ دونوں کلاس فیلو تھے رشید کی جن اداؤں نے الوری کو مارا تھا ان کا تعلق محض صورت اور لباس سے نہ تھا۔ ایک تو وہ اپنی ذہانت اور قابلیت کے لئے کالج کے ہر حلقوں میں بھی شہرت رکھتا تھا دوسرے اس کے اندر وہ دلکشی بھی موجود تھی جو رومانی ناولوں کے ہیرو میں ہوا کرتی ہے وہ رشید کو دیکھتی تو اسے محسوس ہوتا کہ وہ بچپن سے اس کو کتابوں میں پڑھتی رہی ہے اور خوابوں میں دیکھتی رہی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ محبت کی روایت کے خلاف محبت کی پہل بھی الوری ہی نے کی تھی مگر آج کی گفتگو میں رشید نے قصداً اس پر پیش قدمی کا الزام نہیں رکھا کیوں کہ اس کو اپنے وہ الفاظ خوب یاد تھے۔ جو اس نے محبت کی پہلی ملاقات میں کہے تھے۔ اس نے الوری کی معطر زلفوں کو اپنے ہونٹوں سے مس کرتے ہوئے کہا تھا۔

"اچھا کیا جو تم نے پہل کر دی ورنہ تمہیں پانے کے لئے دل ہی دل

میں وحشی پن کی حد تک میں بے تاب ہو چکا تھا اگر تم نے تھوڑی دیر کی ہوتی تو میں نے سوچ رکھا تھا کہ کسی دن اچانک تمہارے ہونٹوں کو چوم کر خودکشی کر لوں گا۔" محبت کی پہلی ملاقات کی یہ بات چیت جیتے جی بھلائی نہیں جا سکتی تھی۔

کہاں محبت کی گرمجوشی کا کبھی یہ عالم تھا اور کہاں زندگی کی بیرحم حقیقتوں نے اب محبت کے نازک اور لطیف احساسات میں نشتر چبھو چبھو کر اس کو لہولہان کر دیا تھا۔ انوری نے صرف محبت کا خواب دیکھا تھا اور رشید نے محبت کے ساتھ ساتھ زندگی کی آرائشوں اور آسائشوں کے خواب بھی دیکھے تھے اس کے خواب ادھورے رہ گئے اور آرزوؤں کی تشنگی نے محبت کو قصوروار ٹھہرا کر ایک نادانستہ انتقام لیا تھا کہ پھول کا رنگ روپ تو رہنے دیا مگر اس کی خوشبو چرالی۔ ایک طرف ساس کے تیر و نشتر دوسری طرف کل کے عاشق آج کے شوہر کا یہ حال کہ جذبات سے بے گانگی اور جسم سے دل چسپی حساس اور محبت کی ماری انوری کو اس دوہرے ستم نے گھائل اور نڈھال کر دیا تھا۔

آج رشید کی بہن نے سسرال سے آنسوؤں سے بھرا ہوا ایک خط بھیجا تھا جس کو پڑھ کر ماں درد سے تڑپ اٹھی تھی اور باپ کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں خاطر خواہ جہیز وغیرہ نہ ملنے کے سبب اس پر

بڑے بڑے ستم ڈھائے جارہے تھے۔ کہا جارہا تھا کہ ان کے گھر کا تو چلن ہی ایسا ہے کہ لین دین کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کہیں سے ننگی بچی اٹھا لائے ہیں کہیں ننگی بچی پھینک آتے ہیں۔ ماں تو بیٹی کی اس ہیٹی پر پچھاڑیں کھانے لگی۔

اور یہ الزام بھی انوری ہی پر آیا۔

اگر انوری اپنے ساتھ کچھ لائی ہوتی تو بیٹی کو جی بھر کر اور رلاد کے سب کچھ دیا ہوتا یہ تو زمانے کا دستور ہی چلا آتا ہے کہ بڑی بہو چھوٹی بیٹی کی تقدیر بن کر آتی ہے۔ اس الزام نے انوری پر جہنم کا ایک اور دروازہ کھول دیا اور ساس نے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے ان دونوں کی روسیاہ محبت کو ایسے ایسے گھنونے طعنے دیئے تھے کہ انوری کو اپنا وجود زمین میں دھنستا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔

انوری کی غیرت نے مشورہ دیا کہ محبت میں جینے سے محبت میں مرنا بہتر ہے۔

رشید کو خاموش دیکھ کر انوری نے کہا: آج گھر میں جو کچھ ہوا اس کو دہرانے سے شاید زبان کٹ کے گر جائے۔ خدا کرے اب اس بستر سے میری میت ہی اٹھے۔ میں خودکشی نہ بھی کروں تو یہ روح کا کینسر مجھے اب دھرتی کے اوپر نہیں رہنے دیگا۔"

اپنی مظلومیت اور ستم زدگی کی باتیں کرتے ہوئے پہلے تو انوری کی آنکھوں سے پل پل آنسو گرا کرتے تھے مگر آج اس کی آنکھوں

میں صرف سوگ تھا آنسو نہیں تھے۔ آج رشید کی آنکھوں کے سوتے ہرے ہو گئے۔ گھر کی دائی نے اس کو بتایا تھا کہ کس طرح ماں نے انوری کی آبرو کا پیرہن تار تار کیا تھا۔

خوشبو سے عاری محض رنگ روپ والا پھول ایک بار پھر مہک اُٹھا۔

اور پھر ایک ہفتہ بعد جب رشید انوری کو لے کر کسی دوسرے مکان میں منتقل ہونے کے لئے مکان درست کرنے لگا تو ماں سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

رشید نے فیصلہ کن لہجے میں کہا: "امی! میں یہاں رہ کر آپ سے محبت نہیں کر سکتا اور آپ سے محبت کئے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔"

(خاتمہ)

کتبہ: نسیم امروہوی
۸/۷/۶۵ دہلی ۶

بٹوارہ

سی۔ اِل۔ کاوش کا ایک کامیاب ناول

ہمارے دور کے افادی ادب کا نمونہ ہے جس میں سی۔ اِل۔ کاوش کا خلوص ہے، جو اردو ادب کو کلاسیکی معراج پر پہنچاتا ہے۔

"بٹوارہ زدہ خاندان کا صحیح عکس ہے" شمس کنول اور اردو کے مایۂ ناز ادیب راما نند ساگر نے لکھا ہے کہ "کاوش کا انداز بیان پٹھان دوشیزاؤں کے حسن کی طرح نکھرا ہوا اور شیریں ہے۔ اس میں پہاڑی جھرنوں کی طرح ایک خوش گوار روانی ہے اور ریگستان کے بدوؤں کی طرح وہ سیدھی سادی بات میں بھی دانائی کے موتی بکھیر جاتا ہے" اور اس کے افادی پہلو پر خواجہ احمد عباس نے یوں روشنی ڈالی ہے کہ "...... مگر پٹھان ہونے کے علاوہ ایک حساس ادیب بھی ہیں۔ سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی مسائل پر انہوں نے پڑھا بھی اور لکھا بھی ہے" کاوش کا نصب العین اور نظریۂ زندگی ان کے نئے ناول "بٹوارہ" میں ملتا ہے۔

صفحات ۳۵۱، قیمت: ۵/۷۵

مکتبہ نئی زندگی۔ ۲۱۷۵۔ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

”. . اور طوفان تھم گیا“

اُردو کے مشہور صاحبِ طرز ادیب، قیصر عثمانی صاحب کا ناولٹ جس میں سماج کا عکس، فلمی زندگی کی ناکامیاں ہیں اور ان سے متعلق لوگوں کی قلمی تصویریں ہیں۔

قیصر عثمانی صاحب چونکہ فلمی دنیا کے ایک ممتاز رکن ہیں، ان کی تحریر گویا اس میں بسنے والے لوگوں کی سچی عکاسی ہے، جسے مکتبہ نئی زندگی پہلی مرتبہ شائع کر رہا ہے۔ قیمت -/1

اپنی کتابوں کی

جملہ ضروریات کے لئے ہمیں یاد فرمایئے

ہم اپنی اور تمام پبلشروں کی نئی سے نئی تمام قسم کی کتابیں آپ کو یکجائی طور پر مہیا کر سکتے ہیں

لائبریریوں کے ساتھ خاص رعایت

فہرست کتب مفت طلب فرمایئے

مکتبہ نئی زندگی، ۲۱۷۵، قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

قومی نظموں کا انتخاب

نذرِ وطن

جس میں

ملک کے ممتاز شعراء کی ولولہ انگیز نظمیں

ہیں

مرتبہ: شرافت حسین مرزا

ضخامت: ۱۰۴ صفحات مجلد

قیمت: ایک روپیہ پچاس پیسے

مکتبہ نئی زندگی - ۲۱۷۵ - قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶
(اعلیٰ پرنٹنگ پریس دہلی)

عہد اسلامی کا ہندوستان

از: سید ریاست علی ندوی

برطانوی استعمار نے ڈیڑھ دو سو برس کی مسلسل کوشش سے ہندوستان کی تاریخ کو اس طرح مسخ کیا ہے کہ ایک طرف مسلمان اپنے اسلاف کے کارناموں کو دیکھ کر شرمائیں تو دوسری طرف ابنائے وطن میں بھی ان کے خلاف غصہ و عناد کے جذبات پرورش پائیں۔ استعماریت کا یہ حربہ کامیاب رہا اور مسخ شدہ تاریخوں کے انبار لگ گئے۔

"عہد اسلامی کا ہندوستان" میں مولانا سید ریاست علی ندوی نے ہندوستان کی مسلم حکومت کے اصل خدوخال دکھانے کی کوشش کی ہے جس سے مسلم عہد کے ہندوستان کا صحیح نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی پس منظر میں ہندوستان کے عہد قدیم کی اجمالی تصویر بھی نظر آتی ہے۔ تاریخ کے طلبہ و ارباب ذوق کے لیے یہ کتاب بے حد مفید ہے۔

قیمت مجلد: چھ روپے آٹھ آنے

مکتبہ نئی زندگی
۲۱۷۵ - قاسم جان اسٹریٹ - دہلی ۶